انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو دہلی

مدیر مسئول : سید راشد حامدی   مدیر اعزازی : ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

مدیر معاون : محمد اسعد فلاحی

جلد۔۶ ، شمارہ ۔ ۱ | جنوری ۲۰۲۱ء | جمادی الاخریٰ ۱۴۴۲ھ

ادارتی امور کے لیے رابطہ کریں: 9927206518،8287025094 | انتظامی امور کے لیے رابطہ کریں: 7011838453

ای میل:jareedahayatenau@gmail.com

فی شمارہ	:	اندرون ملک	۳۰/روپے
		بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
خصوصی شمارہ	:		۱۰۰روپے
سالانہ زرتعاون	:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
		بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
		بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

مجلس ادارت

۱۔مولانا ظفر احمد اثری فلاحی، لندن

۲۔ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، علی گڑھ

۳۔مولانا انعام اللہ فلاحی، دہلی

۴۔مولانا عبد البر اثری فلاحی، ممبئی

۵۔مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، جامعۃ الفلاح

۶۔امتیاز وحید فلاحی، کولکاتا

۷۔محمد انس فلاحی مدنی، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

ہمارے نمائندے

۱۔رضوان احمد فلاحی، لندن

۲۔موسیٰ کلیم فلاحی، متحدہ عرب امارات

۳۔حسن حبیب فلاحی، نیپال

۴۔فیاض احمد فلاحی، قطر

۵۔محمد سموئیل فلاحی، کویت

۶۔ڈاکٹر انعام اللہ فلاحی، سعودی عرب

۷۔ذوالقرنین حیدر فلاحی، ملیشیا

★ رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگوانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

★ مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
Printed at: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Ziauddin Falahi**

نقوشِ حیات

اداریہ	ضیاءالدین ملک فلاحی	۴
قرآنیات		
افادات جلیل احسن ندویؒ (قسط:۱۶)	ظفراحمدالاثری	۱۰
درسِ حدیث: خوش کلامی	انعام اللہ فلاحی	۱۹
زاد راہ:		۲۳
ملک وملت کی تعمیر وترقی میں فارغینِ مدارس کا مطلوبہ کردار	محمد طاہر مدنی	
تعلیمی آپ بیتی: سلفیت اور تحریک اسلامی کا سنگم	عبید اللہ فہد فلاحی	۲۹
میڈیا اور مسلمان		
معاشرے کی تعمیر میں صحافت کا کردار	انتخاب عالم شمسی	۴۲
مقاماتِ آہ وفغاں اور بھی ہیں	عبداللہ زکریا	۴۷
جمہوری ملک میں جمہوری صحافت	صفی الرحمٰن نبیل	۵۴
منتشر سماج میں میڈیا کا کردار	ابوعبداللہ فلاحی	۵۸
شخصیات		
پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ: ایک عظیم سیرت نگار	ضیاءالدین ملک فلاحی	۶۲
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز	محمد مشتاق فلاحی	۷۶
ڈاکٹر محمد رفعت: مشفق استاد، مہربان مربی	محمد اسعد فلاحی	۷۹
بولتی تصویر: چاند پٹی کی سرزمین سے دو تصویریں	حافظ فیضان احمد فلاحی قاسمی	۸۴
بستی، نیک تاجر اور روشنی کا مینار	صباح الدین اعظمی	۸۶
نقد و تبصرہ: جہاد اور آیات جہاد	محمد غطریف شہباز فلاحی ندوی	۸۸
جامعہ کے لیل و نہار	مصباح الباری فلاحی	۹۲
اخبارِ انجمن	ادارہ	۹۵

مقالہ نگاران

۱-مولانا ظفر احمد الاثری، اسلامک دعوہ سینٹر، یو کے اسلامک مشن، برطانیہ

۲-مولانا انعام اللہ فلاحی، سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح وسابق صدر مدرس جامعہ مصباح العلوم

۳-مولانا طاہر مدنی، استاد جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

۴-ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔

۵-ڈاکٹر انتخاب عالم شمسی فلاحی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ ماس کمیونی کیشن، سندیپ یونی ورسٹی، مدھوبنی، بہار

۶-جناب عبد اللہ زکریا، آزاد صحافی، علاء الدین پٹی، مقیم حال ممبئی

۷-جناب صفی الرحمٰن نبیل، طالب علم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۸-جناب ابو عبد اللہ فلاحی۔

۹-محمد مشتاق فلاحی، میڈیا سکریٹری وحدت اسلامی ہند، مقیم حال اورنگ آباد

۱۰-جناب محمد اسعد فلاحی، مدیر معاون حیاتِ نو

۱۱-جناب حافظ فیضان احمد فلاحی قاسمی، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی

۱۲-ڈاکٹر صباح الدین اعظمی، اسسٹنٹ پروفیسر، شارجہ، یو اے ای

۱۳-ڈاکٹر محمد غطریف شہباز فلاحی ندوی، ریسرچ ایسوسی ایٹ مرکز فروغ تعلیم وثقافت مسلمانان ہند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۴-مولانا مصباح الباری فلاحی، استاد جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۵-ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، مدیر حیات نو، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو علی گڑھ

اداریہ

تحریک اسلامی کے بنیادی لٹریچر کی معنویت

(ڈاکٹر محمد رفعتؒ کا استفادہ)

تحریکی لٹریچر بیسویں صدی کا ایک معجزہ ہے۔ علمی دنیا میں عالمی سطح پر اس کا استقبال کیا گیا۔ محققین ومترجمین نے اسے دنیا کی معروف زبانوں میں منتقل کیا۔ اس لٹریچر کی خصوصیات میں اس کا قرآن وسنت کو ماخذِ اصلی بنانا ہے۔ تحریکی لٹریچر میں مقصدیت، آفاقیت، توسع، عصریت، جامعیت، معروضیت اور علمیت جیسے اہم عناصر نے اسے فکرِ اسلامی کا دائرۃ المعارف بنادیا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م۱۹۷۹ء) نے روداد جماعت اسلامی ہند جلد سوم میں اس تحریکی لٹریچر کو قیامِ جماعت کے فوراً بعد دیگر زبانوں میں ترجمہ کرانے کی پہل کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ انگریزی، عربی، ترکی، ملیالم، تامل، گجراتی، ہندی اور سندھی زبانوں کے ماہرین کے ساتھ اپنی جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، وہ ہیں: رسالہ دینیات، خطبات، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، سلامتی کا راستہ، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ تحریکِ اسلامی کے بنیادی لٹریچر کی تخلیق وتیاری میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی خدمات کا بجاطور پر اعتراف خود بانیِ تحریک نے مختلف انداز میں کیا ہے۔

تحریکی لٹریچر میں 'اقامت دین' کی اصطلاح کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جس کی عملی جدوجہد کی خاطر جماعت اسلامی کی تاسیس عمل میں آئی اور غیر منقسم بھارت کی باصلاحیت قیادت نے اس کا استقبال بھی کیا۔ وہ تحریکی لٹریچر جو غیر منقسم بھارت میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے آبشارِ قلم کی دین ہے، بعض حلقوں کی جانب سے اس کی تدوین وتشکیلِ نو کی بات اٹھائی جاتی رہی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے بعض کتابوں کی طباعت بھی روک دی گئی اور ایسا ہونا عین فطری ہے کہ ہر محقق، مصلح اور مجدد زمینی حقائق کا انکشاف کرتا ہے، بعض پہلو اپنی افادیت کے لحاظ سے آفاقی نوعیت کے ہوتے ہیں اور بعض مخصوص حالات کی پیداوار۔ اسی وجہ سے علمی دنیا میں ایڈیٹنگ کے عمل میں ان کی تاریخی حیثیت اور سیاق وسباق کا تذکرہ کردیا جاتا ہے۔ اس طرح قدیم سے جدید تک منتقلی بھی ہوتی ہے اور اس کی تقصیرات سے تحفظ بھی۔

تحریکی لٹریچر کی افادیت ومعنویت کو آج کم وبیش اسی (۸۰) برس ہونے جارہے ہیں اور دنیا کے بیش تر ممالک میں دین کی قرآنی تفہیم وتعبیر میں صفِ اول کے لٹریچر کی حیثیت سے اس کا مطالعہ واستفادہ جاری ہے۔ تفہیم القرآن کی چھ(٦) جلدوں کو ان میں کلیدی مقام حاصل ہے۔جس کے ترجمے دنیا کی معروف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اس لٹریچر کے زیراثر دیگر تیار شدہ تخلیقات کا ریویو (Review) اس وقت پیشِ نظر نہیں ہے۔ یہاں پر صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ افکار ونظریات، اداروں اور تنظیموں کی گزشتہ صدی میں سید مودودی کے ذریعہ دین کے تمام گوشوں پر محیط اردو زبان میں لٹریچر تیار کرنا اللہ تعالیٰ کی نمایاں آیات میں سے ایک آیت ہے۔ چنانچہ اس سرمایہ کے میدان میں آتے ہی مسلم معاشرہ کے چنیدہ اصحابِ علم اس کی طرف پروانہ وار دوڑتے چلے گئے۔قربانیوں، عزیمتوں اور خدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔اس لٹریچر کی معنویت آج تک مسلّم ہے۔اس لٹریچر کے شیدائیوں میں سے ایک معتبر نام پروفیسر محمد رفعت کا ہے۔

پروفیسر محمد رفعت (۲۹/جولائی ۱۹۵٦ء-۸/جنوری ۲۰۲۱ء) نے مسلم یونی ورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں اس کی افادیت ومعنویت کو اپنے تشکیلی عناصر میں سب سے اعلیٰ مقام دیا۔اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ اس کے تحفظ کا سامان کیا اور تادم واپسیں انھیں بنیادی مصدر کی حیثیت سے استعمال کیا۔تحریکی حلقے میں اس کثرت سے تحریکی لٹریچر کی مراجعت کرنے والا غالباً یہ پہلا محقق ومصنف ہے جس نے دینی وتحریکی اور اصلاحی ودعوتی، خالص تحقیقی وسائنسی مباحث میں بھی ابتدائی اکابرین کی تخلیقات کے لمبے لمبے اقتباسات سے اپنی تحریروں کا قد بلند کیا۔موصوف کو چمن تحریک اسلامی کا دیدہ ور کہا جاسکتا ہے۔اپنی متوازن فکر، شورائی مزاج اور وسعت نظری کی اعلیٰ قدروں کی وجہ سے تحریکِ اسلامی کے قافلہ کا وہ ایک اہم ستون تھے۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ۱۹۷٦ء میں ایم اے (فزکس) اور ۱۹۸۴ء میں آئی آئی ٹی کانپور سے پی ایچ ڈی کی سند سے فیض یاب کیے گئے۔۱۹۸۵ء میں اپنی علمی قابلیت کی بنا پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فزکس میں استاد مقرر ہوئے۔ جہاں سے بحیثیت پروفیسر ۳۱/جولائی ۲۰۲۰ء میں سبک دوش ہوئے۔کانپور میں بطور خاص موصوف نے مسلم وغیر مسلم اصحاب علم کے درمیان اپنی خداداد علمی بصیرت، منطقی وتحقیقی انداز اور خاک ساری وتواضع کی وجہ سے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا۔

ڈاکٹر محمد رفعت نے دس (۱۰) سالہ مدت ادارت، زندگی نو اپریل ۲۰۰۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء میں تقریباً پچاسی (۸۵) مقالات، ایک ہزار ایک سو چھپن (۱۱۵٦) صفحات تحریر کیے۔ان اداریوں کو بعد میں ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند نے آٹھ موزوں عنوانات کے تحت مرکزی مکتبہ

اسلامی پبلشرز سے چھپوانے میں تعاون کیا۔ان کتابوں کے اندر مقالات کو ذیلی عنوانات سے مزین و آراستہ کرنا اور کتابوں کا عنوان رکھنا بھی موصوف کی عطایا ہیں، جن کی تصویب و تائید ڈاکٹر محمد رفعت نے کی تھی۔

تحریکی لٹریچر کی معنویت کے حوالے سے تخلیقات رفعت کے ضمن میں چند معروضات پیش کی جاتی ہیں:

ا۔اپنی جملہ تحریروں میں آیات قرآنی کا ترجمہ اور اس کی تفسیر کے لیے تفہیم القرآن کو ترجیحی طور پر استعمال کرتے ہیں۔الجہاد فی الاسلام کو وہ تحریک اسلامی/جماعت اسلامی کا دیباچہ و پس منظر قرار دیتے ہیں۔ جابجا اس کے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔تنقیحات، تصریحات، تفہیمات، روداد جماعت اسلامی، اسلامی ریاست، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حقوق الزوجین، پردہ، سود، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں وغیرہ کو بہ تکرار کسی نہ کسی پہلو سے اپنے مقالات کا بنیادی مصدر بنانے کی دانستہ کوشش کرتے ہیں۔

۲۔تحریک اسلامی کو اس کے عالمی تناظر میں پیش کرنے والوں میں سید قطب مصری، علامہ اقبال ہندی، علی شریعتی ایرانی کے علاوہ متعدد اصحاب علم و تحقیق کی تحقیقات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔اقبال کی عالمگیر قرآنی فکر سے اس قدر متاثر ہیں کہ ان کے اردو اور فارسی کلام کو درج کیے بغیر انھیں اپنی تحریر ادھوری محسوس ہوتی ہے۔مضمون کے آغاز، اندرون اور خاتمہ میں اس کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ **معالم فی الطریق** اور **فی ظلال القرآن** کے مصنف سید قطب، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مصنف علامہ اقبال اور صاحب تفہیم القرآن سید مودودی سے ڈاکٹر رفعت کو ایک عشق تھا، جس کی تمازت سے وہ اپنے قاری کو بھی متحرک و فعال بناتے ہیں۔

۳۔سید مودودی کی مرکزی فکر: اقامت دین کے جن دیگر شارحین سے استفادہ پروفیسر رفعت کی تحریروں میں نظر آتا ہے ان میں نمایاں نام مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا صدرالدین اصلاحی کے ہیں۔انھوں نے مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، سید احمد عروج قادری، سید حامد علی، عبدالحق انصاری، فضل الرحمٰن فریدی، پروفیسر نجات اللہ صدیقی اور مولانا سید جلال الدین عمری کے علاوہ متعدد اصحاب کی کتابوں سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔

۴۔پروفیسر رفعت کے مضامین و مقالات آئندہ ریسرچ و تحقیق کے عنوانات بنیں گے اور محقق اس نتیجے تک ضرور پہنچے گا کہ پروفیسر رفعت کی فکر میں عصری حسّیت، مقصدی جوہر، تجزیاتی و تنقیدی اسلوب، منطقی ربط اور ادب و انشا متعدد خصوصیات دراصل ان کے معنوی و روحانی معلم سید مودودی کا تصرف و عطیہ ہیں۔ان کے بعض مقالات کے عناوین ملاحظہ کریں: (ا) عصر حاضر کی اصل گم راہی: انکار غیب (۲) مغربی سائنس اور فلسفۂ الحاد (۳) انکارِ غیب کا ردعمل (۴) علم کا اسلامی تصور (۵) علوم کی اسلامی تدوین نو کی تحریک (۶) علوم کی

تدوین نو کی ترجیحات (۷) سائنس اور تصور کائنات کے مابین ہم آہنگی (۸) سماجی علوم کی اسلامی اساس (۹) اسٹیفن ہاکنگ کے نظریات کا تنقیدی جائزہ (۱۰) جدیدیت، مابعد جدیدیت اور اسلام (۱۱) حیاتیاتی نظریۂ ارتقا: تعارف وجائزہ (۱۲) سائنس اور ٹکنالوجی: اسلامی نقطۂ نظر (۱۳) مسلم قیادت۔ ہندوستان کے تناظر میں (۱۴) معاصر فضا اور مسلمان: ہندوستان کے سیاق میں (۱۵) عالمی حالات میں تغیر کے اشارے (۱۶) فرائض دین کی جامع تفسیر: اقامت دین (۱۷) نظام اقدار کی اصلاح (۱۸) مسلمانوں کا سیاسی رویہ: ہندوستان کے سیاق میں (۱۹) معاصر دنیا اور دعوتِ اسلامی (۲۰) اقامت دین، دعوت اور جہاد، وغیرہ وہ مقالات ہیں، جن کے اندر پروفیسر موصوف نے تحریکی لٹریچر کی معنویت کو گوندھنے کی شاندار روایت قائم کی ہے۔ ڈاکٹر رفعت نے سائنسی مباحث میں اسلامی نقطۂ نظر کی نہ صرف وضاحت کی ہے اور یونانی علوم کے معاملے میں جدید سائنسی علوم کو مزاج اسلامی سے قریب قرار دیا ہے، بلکہ نالج اسلامائزیشن کے مشکل کام میں سائنسی علوم میں بازیافت کی نشان دہی بھی فرمائی ہے۔ وہ خـذمـاصفاودع ماكدر کے حکیمانہ فلسفہ پر اپنے علمی، فکری اور عملی رویوں میں عامل نظر آتے ہیں۔

۶۔ اقدار و اصطلاحات کے باب میں گرامی موصوف بہت حساس ہیں۔ انھوں نے مغربی وسائنسی تناظر کے مقابلے میں قرآنی تناظر پیش کیا ہے اور علمی وتحقیقی تنقیدات کے ذریعہ قرآنی فکر کو سربلند کیا ہے۔ اور اس پورے ریاض میں تحریکی لٹریچر سے استفادہ کرتے ہوئے اس کی عصری معنویت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا ظاہر جیسا سادہ اور بے آمیز تھا، اندرون بھی اسی قدر اجلا تھا۔ اقدار و اصلاحات کے ضمن میں ان کے استغنیٰ کی کیفیت کا عالم یہ تھا کہ مجدد مودودی سے بے پناہ عشق کے باوجود قرآنی فکر کی عظمت اور بلندی پر کہیں آنچ آنے نہیں دیتے۔ مسلکی اور گروہی تعصب سے پاک ہر جگہ خیر کے متلاشی تھے۔ ان کی یہ عبارت ملاحظہ کریں:

> کچھ عرصے سے بعض دوستوں نے فکرِ مودودی کی اصطلاح کا استعمال شروع کردیا ہے۔ یہ اصطلاح مناسب نہیں۔ جس فکر کو داعیانِ حق کو پیش کرنا چاہیے وہ فکرِ مودودی نہیں ہے، بلکہ فکرِ اسلامی ہے۔ اس کو سمجھنا، فروغ دینا اور دنیا کے سامنے پیش کرنا مقصود ہے۔ ہر صاحبِ علم کی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بڑا کارنامہ یقیناً انجام دیا ہے۔ انھوں نے اسلامی فکر کو سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ (افکارِ مودودی کی عصری معنویت، مشمولہ علم وتحقیق کا اسلامی تناظر ص ۱۲۲)

گرامی رفعت کے مضمون کا یہ حصہ راقم نے قصداً نقل کیا ہے تاکہ مختلف ناموں کے لاحقے اور سابقے کے ساتھ جو فکر انسانوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے وہ عصبیت سے منزّہ اور پاک ہوسکے اور افکار وخیالات کی پیش کش میں غیر ضروری مسابقت کے غیر فطری رجحان کو لگام دی جاسکے۔ بلاشبہ کسی سیاق کا اقتضا ہوتا ہے کہ

ناموں کے لاحقے لگائے جائیں، لیکن خدانخواستہ فکرِ اسلامی کے مقابلہ میں ممدوح کی خدائی اگر مطلوب ومقصود ہے تو یہ خسران کا سودا ہوگا۔

۷۔تحریک اسلامی کے لٹریچر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ عنوان کے مالہٗ وماعلیہ کا احاطہ کرتا ہے۔عرض مسئلہ کے ساتھ نفس مسئلہ سے متعلق مقدمات قائم کرتا ہے۔سوالات ابھارتا ہے۔مسائل کو محدود ومنظّم کرنے کی خاطر اقسام اور خاکے وخانے بناتا ہے اور خاتمہ میں قاری کو عزم وارادہ، جوش وجذبہ، حرکت وعمل اور امیدوں کے چراغ عطا کرتا ہے۔ پروفیسر رفعت نے اپنی تمام تحریروں میں تحریکِ اسلامی کی اس خوبی کو خوب صورتی کے ساتھ اپنایا اور اسے بالعموم برتنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔تنقیدی واحتسابی رنگ وقدر کو اپنی آرا سے مزین وآراستہ اور تحریروں کی پیش کش کے ذریعہ خود کو معتبر شارحین فکر اسلامی میں داخل کر لیتے ہیں۔

۸۔تحریک اسلامی کے بنیادی لٹریچر کے ذریعہ فکر اسلامی کی عالمی اثر پذیری کا مطالعہ تحقیق کے طلبہ کا موضوع بننا چاہیے۔اس ضمن میں بعض کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں۔جن کے ذریعہ عالمی اثرات کا ایک اشارہ ملتا ہے، تاہم گہرے تجزیے کے لیے میدان ہنوز خالی ہے۔روداد کی جلدوں میں بانیِ تحریک اسلامی نے پورے عزم کی ساتھ دعوے کیے ہیں کہ قرآنی فکر ہی کی بالآخر فتح ہوگی۔انھیں اپنی تحریروں کی تاثیر کی بابت یقین تھا کہ قرآنی اصطلاحات ومعانی کی مسلسل تکرار سے علمی فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ گرامی رفعت نے پوری شعوری زندگی میں تحریک اسلامی کی معنویت کو مختلف اسالیب میں بیان کیا ہے۔ جماعت اسلامی کی پانچ بنیادی خصوصیات (جو اسلامی تحریک، سفر اور سمت سفر میں بھی شامل ہے) بنیادی طور پر زندگی نو، نومبر ۲۰۱۰ء کا، اشارات ہے۔یہ تقریر جماعت اسلامی ہند کے تیسرے کل ہند اجتماعِ ارکان کے موقع پر پیش کی گئی تھی۔وہ پانچ خصوصیات یہ ہیں: (۱) ماضی کی تحریکات اسلامی سے ہم آہنگی کا شعور (۲) امت کے ساتھ یک جہتی کا احساس (۳) فرقہ بندی سے اجتناب (۴) شورائیت اور احتساب کی روایات کی تجدید (۵) امت مسلمہ اور عالم انسانیت کے درمیان تعلق کی نشان دہی۔ بارہ (۱۲) صفحات کے اس مقالے میں گرامی رفعت تحریک اسلامی کی عصری معنویت ومعقولیت ثابت کرتے ہیں۔اس ضمن میں ان کا مضمون 'افکارِ مودودی کی عصری معنویت' (مشمولہ علم وتحقیق کا اسلامی تناظر، ص:۱۳۴۔۱۲۲) لائق مطالعہ واستفادہ ہے۔

۹۔تحریکی لٹریچر کی اس خوبی کا بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ اس نے اسلامی تعلیمات، احکامات اور مطالبات کو بے کم وکاست واضح کیا ہے۔ حالات وزمانہ کی رعایت کی ہے۔مقاصد شریعت، معاصر عالمی چیلنجز، ملکی وسیاسی مسائل ومشکلات پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔ بھارت کی سیاسی کشمکش، آزادی سے پہلے سیاسی

موقف وکردار کی وضاحت اور آزادی کے بعد بطور خاص مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ نے مسلم منشور، مسلم موقف اور لائحۂ عمل پیش کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اپنے سیاسی مقالات (جن کا تذکرہ گزر چکا ہے) میں ان موضوعات کو از سر نو زندہ کیا ہے اور پوری قوت کے ساتھ تحریک اسلامی کی سیاسی تعبیرات اور جماعت اسلامی کے دینی موقف اور اس کی تعبیرات کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے تمام مسلمانوں کو اسلام کو بطور 'دریافت' نہ کہ بطور 'میراث' قبول کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ انہوں نے اسلام کی دعوت کو تمام باشندگان ملک تک پہنچانے کی مختلف تحریروں اور تقریروں میں تلقین کی ہے۔ ان کا کامل یقین ہے کہ نور کے مقابلے میں ظلمت کبھی ٹک نہیں سکتی۔ خیر اگر منظّم ہو تو منتشر شر کے شرارے کبھی بھی کسی نشیمن کو خاکستر ہرگز نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ عبارت دیکھیں:

> ''ملک کا مزاج اس پہلو سے بھی امکان فراہم کرتا ہے کہ ملک کا بڑا طبقہ مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ غیر جانب دار ہے اور اس کا مزاج ساری کوششوں کے باوجود مسلم دشمن نہیں بن سکا ہے۔ موجودہ تحریکات اور موجودہ کلچر نے جو سوالات پیدا کر دیے ہیں، ان سوالات کا جواب دیا جائے، ان معاملات پر مسلمان گفتگو نہیں کرتے۔ یہ ہمارے دینی سماج کے موضوعات نہیں بنتے۔ ایمان ایک روایتی ایمان ہوتا ہے جو اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ دوسروں کو دعوت دے سکے۔'' ہندوستان میں دعوت۔ مواقع و امکانات (ماہنامہ افکار ملی، اگست ۲۰۰۷ء)

۱۰۔ اپنے بنیادی لٹریچر میں بانیِ تحریک نے جو چودہ سو سالہ اثرات اسلامی کو مفسرین، محدثین اور فقہاء عظام سے کشید کر کے اردو قارئین کے حوالے کیا ہے۔ مجدد مودودی نے تجدید و احیائے دین میں مجددین امت کی گراں قدر خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان خدمات کی بعض تقصیرات کا احاطہ بھی کیا ہے۔ کسب و استفادہ کی روایت کو مودودیؒ کے سب سے بڑے ترجمان و رمز شناس مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے توسیع بخشی۔ جنہوں نے ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ سے نسبتاً زیادہ استفادہ کیا ہے۔ پروفیسر رفعت نے سائنسی مزاج اور مربوط بیان کے ذریعہ سرمایہ مودودی کو مزید تقویت بخشی۔ گرامی موصوف نے معاصر عہد کے دو جلیل القدر علماء کرام: مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی آرا سے فکرِ اسلامی کے کینوس کو مزید صیقل کیا اور اسے وسعت عطا کی ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
۱۴ جمادی الثانی ۱۴۴۲ھ/ ۲۸ جنوری ۲۰۲۱ء

قرآنیات

افادات جلیل احسن ندویؒ (قسط:١٦)

ظفر احمد الاثری

سورۂ مومنون

(آیت ١) مستقل کامیابی مومنین کے لیے اور یہ آخرت میں ہوگی۔ (آیت ٢) ان نمازوں میں خدا کی کبریائی اور اس کی بڑائی کا احساس ہوتا ہے اور اپنے اندر کمزوری اور فروتنی محسوس کرتے ہیں۔ اس کا اثر ان کے دلوں پر ہوتا ہے، اس کے بعد ظاہری اعضا پر ہوتا ہے۔ (آیت ٣) لایعنی باتوں سے دل چسپی نہیں لیتے، بلکہ اس سے بے رخی برتتے ہیں اور اس سے بے زار ہو جاتے ہیں۔ (آیت ٤) **فاعلون الخیرات لیزکوا نفوسھم**۔ (آیت ٥) اور اپنے شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ (آیت ٦) جاہلیت میں نکاح کے دو طریقے تھے۔ ان میں ایک نکاح المقت تھا۔ (١) (باندی) وہاں باندیوں کا دو طبقہ ہوتا تھا۔ ایک وہ طبقہ تھا جو باندیاں جنگ وغیرہ میں پکڑی جاتی تھیں اور غلام بنالی جاتی تھیں۔ دوسرے وہ باندیاں ہوتی تھیں جن سے اہل عرب جانوروں جیسا سلوک کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ (آیت ٧) اگر ایسا نہ کریں تو پوری انسانیت پر ظلم کرنے والے ہیں اور سوسائٹی پر اس کا بہت ہی گہرا اثر پڑے گا۔ (آیت ٨) اور وہ ایسے ہیں کہ اپنے وعدوں کا پاس ولحاظ کرتے ہیں۔ رسول سے جو عہد و پیمان کیے ہیں انہیں پورا کرتے ہیں اور وہ تمام عہد جو ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو پورا کرتے ہیں اور جو قول وقرار کیے ہیں ان کا پاس ولحاظ کرتے ہیں۔ (آیت ٩) اور مال کی طرح نماز کی حفاظت کرتے ہیں اور تمام نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ (آیت ١٠) یہی لوگ وارث ہوں گے۔

(آیت ١١) یہی لوگ فردوس کے حق دار ہوں گے جو جنت کا سب سے اونچا مقام ہے۔ هُمۡ فِيۡهَا: مبتدا (خَالِدُوۡنَ) خبر (آیت ١٣) (نطفة) وہ پاک شئی جو میاں اور بیوی کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے، اس کو نطفہ کہتے ہیں۔ (مکین) مضبوط (فی قرار مکین) رحم مادر (١٤) (علقہ) جما ہوا خون (عظام) اپنی ترتیب کے ذریعہ

گوشت کو کچھ ہڈیوں میں بدل دیا، پھر اسی ہڈی کی دوسری شکل ہوگئی یعنی یہ کہ ایک قطعہ مختلف مراحل طے کرتا ہے، اخیر میں ہڈی کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر یہی ہڈی انسانی شکل کا روپ دھارتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ایک انسان کو اتنے مراحل سے گزار کر پیدا کرتا ہے تو اس کے اندر اس کی قدرت کی نشانی موجود ہے۔ اور وہ بہترین خالق ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو اسی کی طرف بھاگنا چاہیے۔ (آیت ۱۴) عقل وشعور اس بات پر دال ہیں کہ قیامت آئے گی۔ (آیت ۱۵) پھر اس کے بعد مرنا ہے۔ (آیت ۱۶) حساب کے لیے اٹھائے جاؤ گے۔ آخرت میں دائمی کامیابی حاصل ہوگی۔ اس کی دلیل دی جارہی ہے۔ (آیت ۱۳۔۱۶) ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی خلقت کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ انسان کوئی ایک مرحلہ سے گزر کر عدم سے وجود میں نہیں لایا گیا ہے، بلکہ خدا نے اپنی قدرت سے اسے سات مرحلوں سے گزارا ہے اور ہر درجے میں خدا نے بہترین طریقے سے اس کو وجود میں لانے کے لیے اپنی قدرت سے بناتا رہا ہے۔ لیکن انسان اللہ تعالیٰ کی ان ساری قدرت ورحمت کو بھول جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنی کمر کس لیتا ہے اور کوئی بھی بات سننے سے گریز کرتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کی خصوصیت ہے کہ جب وہ اکڑتا ہے تو وہ خوب اکڑتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ انسان کی خلقت کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ مکہ والوں سے مخاطب ہے کہ اے لوگو! ذرا تم اپنی خلقت پر نظر نہیں ڈالتے، تم عدم میں تھے لیکن وجود میں آنے کے لیے تم کتنے مرحلے سے گزرے۔ ذرا اس خدا کی قدرت کا تمہارے دل میں یقین نہیں کہ وہ دوبارہ تمہیں مرجانے کے بعد اٹھائے گا، تمہاری خلقت تو صاف طور پر کہہ رہی ہے کہ انسان کا دوبارہ وجود لازمی ہے، اس کی قدرت سے تم کو کیوں انکار ہے۔ اگر اس کی قدرت نہ ہوتی تو کیسے تم کو عدم سے وجود میں لاتا تو پھر تم کو اس کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

(آیت ۱۷) انسان کی تخلیق سے جو بات نکل کر آتی ہے وہ یہ کہ اللہ کی قدرت انسان پر محیط ہے اور اس پر بہت ہی مہربان ہے۔ اور آسمان کی تخلیق تمہارے لیے ہوئی ہے۔ (**سبع طرائق**) مراحل، (**فوقکم**) تمہارے اوپر جاری کیا ہے۔ الثانی۔ سبع طرائق، طباق۔ (آیت ۱۸) تمام چیزیں جہاں کہیں بنی ہیں ان کی ضروریات سے ہم غافل نہیں ہیں۔ مثلاً زمین ہے تو اس کو کتنی روشنی چاہیے، ہم پورے علم کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ (بقدر) ٹھیک اندازے سے۔ (**فی الارض**) زمین کے لیے اتارا اور زمین میں جمادیا، اور اس کو تباہ کردینے پر قادر ہے۔ پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا۔ (آیت ۱۹) باغات پیدا کیے (منھا) جو بطور غذا کھائے جاتے ہیں۔ (**انشانا شجرۃ**) یہ جزیرہ نما سینا میں اگتا ہے۔ (**دھن**) روغن لیے ہوئے،

(صبغ) سالن، خاص طور سے اس لیے ذکر ہوا کہ وہاں کا اچھا ہوتا ہے۔(آیت ۱۸) ہم انسانی ضروریات کے بقدر پانی اتارتے ہیں اور اسے زمین کے گوشے میں جمع کر دیتے ہیں، پھر ایسی بات نہیں کہ ہم اسے برباد نہ کر سکیں بلکہ بآسانی برباد کر سکتے ہیں۔ انسان کی یہ اولین ضروریات میں سے ہے، اس کے بغیر انسانی زندگی کا قائم ودائم رہنا ناممکن ہے۔ اسی لیے پانی کو نعمت عظمیٰ گنا کر سرفہرست رکھا۔(آیت ۱۹) اس کے بعد انسانی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے زمین سے طرح طرح کھانے کی چیزیں فراہم کیں۔ اور کھانے کی چیزیں جو انسان کے لیے ضروریات میں پانی کے بعد نمبر ۲ کی ضروریات میں سے ہیں۔(آیت ۲۰) اور اسی پانی سے طور سینا میں ایک درخت نکالتا ہے اور یہ درخت خدا کی قدرت سے تیل پیدا کرتا ہے اور اسے اہل عرب سالن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔(آیت ۲۰) **(بالدهن)** تیل لیتے ہوئے اگتا ہے۔

(آیت ۲۱) کیسا اور کس قدر وہ رحمان ورحیم ہے دیکھو تو ذرا، جانور دودھ دیتے ہیں اور تم اسے استعمال کرتے ہو۔ اور تجارت کرتے ہو اور ان کو کھاتے بھی ہو۔ **هذا يدل على انه هو رؤف ورحيم ولابد ان يحاسبهم**۔ اور تمہاری تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ بدلہ دیا جائے، اور ناشکروں کو ناکامی ملے۔ اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ان سب باتوں کو بتانے کے لیے رسول آئے اور یہ محاسبہ کی دلیل ہے۔ **هذه المحاسبة الصغيرة تدل على المحاسبة الكبيرة**۔(آیت ۲۲-۲۱) پھر یہ بتلایا جا رہا ہے کہ اونٹوں میں ہر بشر کے لیے عبرت کا پہلو موجود ہے وہ عبرت کا پہلو یہ ہے کہ ہم تمہیں اس کے جسم سے صاف شفاف دودھ نکالتے ہیں جسے تم روزانہ استعمال کرتے ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ تمہاری زندگی میں بہت ہی کارآمد ہیں۔ اور تمہاری زندگی میں ان ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں سامان کے نقل وحرکت میں ان سے مدد لیتے ہو۔ ان کے علاوہ تمہارے پاس سواریاں جنہیں تم استعمال کرتے ہو۔ اگر خدا نے یہ نعمت نہ دی ہوتی تو تمہاری تجارت برباد ہو کر رہ جاتی، پھر سواری ہی تک محدود نہیں بلکہ تم ان سے غذا کی قوت حاصل کرتے ہو۔ تو تم خدا کا شکر کیوں کر نہیں بجالاتے ہو۔ یہ تو تھیں تمہاری برّی سواریاں ہیں اور تم اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے بحری راستہ کا بھی استعمال کرتے ہو۔ جس میں طرح طرح کے خوف اور اندیشے ہوتے ہیں، چاہیں تو ہم تمہیں اسی میں ہلاک وبرباد کر دیں اور تم ویسے ہی حسرت کر کے رہ جاؤ۔ بتاؤ تو صحیح، کیا یہ خدا کی نعمت نہیں ہے۔ کیا تمہاری نظر اتنی دوررس نہیں کہ تم ایسے خیالات اپنے ذہن ودماغ میں پیدا کر کے اپنے اندر شکر کا جذبہ پیدا کرو۔ اس کائناتی دلیل کے بعد اب تاریخ کو شاہد بنا کر یہ استدلال کیا جا رہا ہے کہ محاسبہ صغریٰ محاسبہ کبریٰ

کو بتلاتا ہے۔اقوام کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ انسانو! ذرا سنبھل کر قدم آگے بڑھانا، ذرا ٹھہرو، چلنے سے پہلے سوچو،کون سی راہ بہتر ہےاورکون سے تباہ کن۔(آیت ۲۴-۲۳)جب نوحؑ اپنی قوم کے پاس آئے اورانہیں ایک الہ کی دعوت دی توانہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ نوح تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔اس کی خواہش وتمنا ہے کہ تم پر حکومت کرے،تم پر فوقیت چاہتا ہے،تم سے اونچا بن کر رہنا چاہتا ہے، اگر ایسی بات ہوتی کہ نوحؑ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی ہیں تو اللہ ملائکہ کو بھیجتا، اگر خدا کو اپنی کتاب ہی بھیجنی ہوتی تو وہ کسی فرشتے کو ہمارے پاس بھیج دیتا اور اس طرح کی باتیں ہم نے اپنے اگلوں میں نہیں سنی تھیں۔(آیت ۲۵)تم اس کی موت کا انتظار کرو،اس پر ایک طرح کا جنون سوار ہوگیا ہےاور جو دعوت دیتا ہے وہ سب جنی اثر کا نتیجہ ہے۔اس نے گھر گھر میں جدائی پیدا کردی ہے۔اب انتظار کرو کہ کوئی اٹھےاوراسے قتل کردے۔

(آیت ۲۶)جب نوحؑ نے اپنی دعوت کی حجت پوری کردی تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اے میرے رب! میری مدد فرما۔انہوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے،(نصرنا) کا لفظ بتلاتا ہے کہ قوم نے نوحؑ کو مارنے کا فیصلہ کرلیا ہےاورایسے وقت میں خدائے تعالیٰ کا قانون نافذ ہوتا ہے۔(تـــربـــصـــوا)موت کی دھمکی ہے۔
(آیت ۲۷) ہماری نگرانی میں، ہماری وحی کے مطابق انہوں نے کشتی بنانا شروع کیا، جب کشتی تیار ہوگئی تو خدا کا حکم آ پہنچااورزمین کے اوپری حصے سے پانی ابلنا شروع ہوگیا اور یہ پانی پوری زمین پر چھا گیا اور یہی سیلاب کا روپ دھار کر قوم نوح کو غرق کردیا۔اوراللہ تعالیٰ نے نوحؑ کو حکم دیا کہ ہر چیز کا ایک ایک جوڑا رکھ لو۔ اوراپنے ساتھ اپنے خاندان والے جو ایمان لے آئے ہیں سوار کرلو،مگر ان کو نہ لینا جو ایمان نہیں لائے اور تکذیب کی۔اب اس کے بعد ظالمین کو ایمان لانے کی دعوت نہ دینا۔اس لیے کہ ان پر تم نے حجت قائم کردی ہے۔اب ان پر خدا کا فیصلہ اترنے والا ہےاوروہ سب غرق کیے جانے والے ہیں۔ان کے انجام اورخدا کے فیصلہ کو سامنے رکھ کر ان پر دعوت کا دروازہ بند کردیا گیا۔

(آیت ۲۸) پھر یہ حکم ہوا کہ جب تم سب کشتی پر سوار ہوجاؤ تو خدا کا شکرادا کرو کہ اس نے تم سب ہی کو ظالم قوم سے نجات دی۔(آیت ۲۹)اور پھر یہ دعا کی کہ اے اللہ! تو ہمیں بہترین جگہ نصیب کر، جہاں ظالم قوم نہ بستی ہو۔اس لیے کہ تو بہترین جگہ پر اتارنے والا ہے۔(آیت ۳۰)(ان فی ذالک لآیات)اس کی قدرت،اس کی تصرف میں اس کے انعام کی نشانیاں ہیں۔دوسرا پہلو اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو

ایک سر زمیں سے بے دخل کرتا ہے اور دوسرے گروہ کو اس قوم سے نجات دے کر سر بلندی عطا کرتا ہے۔ اور جو لوگ اس کے قانون کا انکار کرتے ہیں اس کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ پھر یہیں تک نہیں بلکہ اس سے یہ استدلال کرنا مقصود ہے کہ یہ محاسبہ صغریٰ 'محاسبہ کبریٰ' پر دلالت کرتا ہے۔ اس دن اولیا اور وفا کیشوں کا معاملہ کچھ اور ہی ہوگا اور مجرموں کا معاملہ اس دن وفا کیشوں کے بالکل برعکس ہوگا۔ جو لوگ بدمعاش ہوں گے انہیں جہنم کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالائیں گے انہیں جنت کی نعمتوں میں داخل کیا جائے گا۔

(آیت ۳۱) (وَاِنْ كُـنَّا لَمُبْتَلِيْنَ) انسان کو الخلق المبتلی بنایا گیا ہے۔ یعنی ہم رسولوں کو بھیج کر انسانوں کو جانچتے ہیں، ایا وہ ہمارے احکام کی پیروی کرتا ہے، ہمارے رسول کی بات مانتا ہے یا اپنی خواہشات کا پیروکار بن کر رہ جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس عمل کو بروئے کار لانے کے لیے انسان کو ارادے و اختیار کی آزادی دی ہے تا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق صحیح وغلط میں تمیز کر سکے۔ پھر اس عمل کے مطابق انہیں بدلہ دیا جائے گا جو رسولوں کی باتوں پر کان دھریں گے انہیں دنیا وآخرت میں خدا کی جانب سے کامیابی ہی کامیابی ہے۔ چنانچہ اسی قانون کے مطابق اس دنیا میں موسیٰ آئے، نوحؑ آئے سبھوں نے خدا کے احکام کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا، کچھ لوگوں نے رسولوں کی بات مان لی، اور کچھ لوگوں نے انکار کر دیا، جب ان پر رسولوں نے اتمام حجت کر دیا تو خدا کی جانب سے مدد آن پہنچی، اور وہ اپنے متبعین کے ساتھ اپنی قوم سے نجات حاصل کر لی اور مکذبین دردناک عذاب سے دوچار ہوئے اور انہیں اس دنیا سے بالکل نیست ونابود کر دیا گیا۔ اسی قانون کے مطابق حضورﷺ اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ اور انہیں اس کام پر معمور کیا گیا ہے، اور حال یہ ہے کہ اکثریت انہیں جھٹلانے پر تلی ہوئی ہے اور کچھ لوگ اقلیت میں حضورﷺ کے ساتھ ہیں۔ تو جان لیں کہ جو لوگ حضورﷺ کی باتوں پر کان دھریں گے وہی کامیابی سے ہم کنار ہوں گے اور جو لوگ ہٹ دھرمی پر اڑے رہیں گے انہیں دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (آیت ۳۱) قوم نوح کو ہلاک کرنے کے بعد دوسری قوم کو ابھارا۔ (قرن) با اقتدار قوم کو قرن کہتے ہیں۔ (قوماً آخرین) اس سے مراد عادی (عام قوم) ہیں۔ (آیت ۳۲) پھر ان ہی میں ایک رسول مبعوث کیا۔ رسول نے انہیں ایک الٰہ کو پوجنے کی دعوت دی اور انہیں ڈرایا۔ (آیت ۳۳) قوم کے سرداروں نے دعوت کا جواب انکار میں دیا اور انہوں نے آخرت میں پیشی کو سرے ہی سے جھٹلا دیا۔ (اترفنافی الحیاۃ الدنیا) (اترف) نعمت پا کر اترانا، ایسا تو ضرور ہوا کہ نبی نے انہیں

دعوت دی، لیکن ان کے پاس مال و دولت کی ریل پیل تھی، دنیوی زندگی ان کی بہت ہی ٹھاٹ سے گزر رہی تھی اور خوش حالی پر خوش حالی تھی، اس لیے انہوں نے اس دعوت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اور ہم نے انہیں ہدایت کر دی تھی کہ نعمت پا کر اترانا نہیں بلکہ رسول کی باتوں کو سننا اور اس پر عمل کرنا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ نعمت دے کر ناشکرے بندے کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے اور ایک شکر گزار بندے کو بھی نعمت دے کر آزمائش میں ڈالتا ہے اور یہ قانون آزمائش ہے جو سب کے لیے ہے، چنانچہ کوئی نعمت کو پا کر گمراہی کی راہ اختیار کرتا ہے، کوئی ہے جو راہ راست اختیار کرتا ہے، چنانچہ انہوں نے بشر کہہ کر اس دعوت کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ اگر خدا کو ہدایت دینی ہوتی تو وہ کسی بشر کے ذریعہ نہیں دیتا۔ (آیت ۳۴) اگر تم اس بشر کی پیروی کرنے لگے تو ہلاک ہو کر رہ جاؤ گے۔ (آیت ۳۵) پھر انہوں نے اس دعوت حق کے خلاف آواز بلند کی، کیا تم مر جانے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے، جب ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گے۔ آخر کار یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ تو ایسا وعدہ ہے جو پورا ہونے کو نہیں۔

(آیت ۳۶) (هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ) اسم الفعل، بعد، بعد، استحالۃ، استحالۃ، بعد وقوعہ۔ (آیت ۳۷) پھر انہوں نے کہا کہ یہ دنیا تو اتنی محدود ہے کہ ہم زندہ ہوتے ہیں اور اس کے بعد مر جاتے ہیں اور پھر دوبارہ کہاں ہم مر کر اٹھائے جائیں گے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ (آیت ۳۸) اور رسول پر یہ الزام لگایا کہ یہ رسول نہیں ہے یہ اپنی طرف سے تمام باتیں پیش کر رہا ہے، سب گھڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کو خدا نے رسول بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ (مانحن) لہٰذا نہ ہم ایمان لائیں گے اور نہ ہم اس کے پیروکار بنیں گے۔ (آیت ۳۹) جب رسول نے ان پر اتمام حجت کر دیا تو اپنے خدا سے دعا کی، اے اللہ! انہوں نے جھٹلا دیا، اب مجھے غلبہ دے اور انہیں ہلاک کر دے۔ باستمرارھم علی التکذیب۔ انہوں نے ہمیں پہلے دن جھٹلایا اور آج بھی جھٹلا رہے ہیں۔ اب یہ ماننے کو نہیں۔ (ما) تحسین کے لیے آیا ہے یا تنکیر کے لیے آیا ہے۔

(آیت ۴۰) (عما قلیل) بعد وقت قلیل۔ تھوڑے ہی دن کے اندر یہ پچھتانے والے ہیں۔ (آیت ۴۱) انہیں اضطراب انگیز آواز نے پکڑ لیا اور نبی کا وعدہ تھا، وہ اس کو نہیں مانے لیکن وہ اپنے وقت پر سچ ہو کر ظالمین کے سامنے نمایاں ہوا، اور وہ تباہ و برباد کر دیے گئے۔ (بالحق) اول۔ وعدہ کے ساتھ، بالوعد الحق۔ الثانی، ایک مقصد کے لیے بنایا۔ (آیت ۴۲) پھر اس کے بعد ہم نے دوسری قوموں کو ابھارا۔ (آیت ۴۱) (بعداً) ہلاکت و بربادی ہو۔ **قیل للظالمین بعداً**، یہ کلمہ لعنت ہے، **هم يبعدون عن الرحمة** ۔ (آیت ۴۳) کسی قوم پر

خدا کا تازیانہ اس وقت اترا جب انہوں نے رسول کی تکذیب کی، عذاب الٰہی کا نزول ان پر ٹھیک وقت پر ہوتا ہے۔(اجل) فیصلۂ عذاب۔(آیت ۴۴) (تترا) متواترین (کذبوا) ای اصرو اعلی الکذب۔ہم یکے بعد دیگرے رسول بھیجتے رہیا ورقوموں نے رسولوں کو جھٹلانے پر اصرار کیا تو ہم نے انہیں یکے بعد دیگرے ہلاک کرکے رکھ دیا۔(**جعلنا**) ہم انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا۔یعنی یہ لوگ کہنے لگے یہاں ثمودی نامی قوم بستی تھی۔**الناس یتحدثون بھم یقولون ان ھنا قوم یسمی بثمود** ۔(بعداً) آج بھی جولوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں۔(آیت ۴۵) پھر ہم نے موسیٰ اور ہارونؑ کو معجزہ اور احکام آیات کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا۔ اور روشن وواضح دلیل دے کر بھیجا۔(سلطان مبین) روشن واضح دلیل۔جب موسیٰ فرعون کے پاس آئے تو فرعون نے سرے سے جھٹلا دیا اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں استکبار کیا۔اس لیے کہ وہ تمام امم پر چھایا ہوا تھا اسی وجہ سے وہ نشہ میں چور تھا،اور موسیٰ کی بات کو ٹھکرا دیا اور استکبار پر تلا رہا۔

(آیت ۴۸) انہوں نے جھٹلایا یا یعنی برابر جھٹلاتے رہے بالآخر وہ اس صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کردیے گئے۔(آیت ۴۹) اس کے بعد موسیٰ کو صحیح راستے پر چلنے کے لیے کتاب دی۔(آیت ۵۰) اور ابن مریم اور اس کی ماں کو ایک نشانی بنایا۔وہ نشانی تھی کہ مریمؑ کو بغیر جنسی تعلق سے عیسیٰ کو پیدا کیا۔اور یہ چیز خدا کی قدرت سے ہوئی تو جو خدا بغیر کسی جنسی تعلق سے کسی عورت کے رحم سے لڑکا پیدا کرسکتا ہے تو اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ قیامت کو نہ برپا کرے۔اگلی عبارت میں مریمؑ کی عبرت کا پہلو ہے۔

(آیت ۵۳) پھر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔اس آیت کا اشارہ یہود ونصاریٰ اور مجوسیوں کی طرف ہے اور مشرکین کو بتلانا ہے کہ تم اپنے دین کو برحق سمجھتے ہو اور محمدﷺ سے لڑ رہے ہو حالانکہ تم سب اصل دین پر قائم ودائم نہیں ہو بلکہ تم نے اصل دین کی شکل بگاڑ دی ہے اور اسی کو حق سمجھ کر جمے ہوئے ہو۔(آیت ۵۴) ضلالت کے گہرے پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور غفلت ایک مقررہ وقت تک ہے۔یہ زمانہ ان کے لیے مہلت کا ہے، پھر بھی اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں بلکہ اس مہلت کو غلط طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔اس میں نبی کے لیے تسلی ہے اور مشرکین کے لیے دھمکی ہے۔(آیت ۵۵) (انما) ماموصولہ،نسارع خبر انّ۔(آیت ۵۶۔۵۵) انہوں نے گمان کرلیا ہے کہ ہم ان کے مال واولاد میں جو کچھ امداد کرتے ہیں تو کیا ہم ان کے لیے بھلائیوں میں اضافہ کرتے ہیں یعنی وہ اس کے مستحق ہیں اور اللہ کے محبوب بندے ہیں۔مال ودولت میں اضافہ اس بات کی دلیل ہے کہ مشرکین مکہ دربار الٰہی کے محبوب بندے

ہیں۔اسی لیے تو مال و دولت کی بارش ہورہی ہے۔کیا ان کا یہ گمان کرنا صحیح ہے؟ نہیں، بلکہ ایسی بات نہیں کہ یہ خدا کے محبوب بندے ہیں۔ان پر اس وجہ سے دولت کی ریل پیل ہے تا کہ یہ ان کے لیے فتنہ بنے، لیکن مشرکین مکہ اس کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ان کا سمجھنا کہ ہم مال و دولت کی وجہ سے خدا کے محبوب بندے ہیں تو یہ غلط ہے۔

(آیت ۵۶) مال و دولت محبوبیت کی دلیل نہیں ہے۔(آیت ۵۷) مومنین کا یہ حال ہے کہ وہ خدا کے خوف سے لرزاں ترساں رہتے ہیں۔(آیت ۵۸) خدا کی طرف سے آئی ہوئی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔(آیت ۵۹) اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں۔(آیت ۶۰) اور انفاق میں بہت آگے آگے رہتے ہیں۔اور دینے کے بعد ان کا دل خوف سے بھرا رہتا ہے کہ قبول ہوا یا نہیں۔ان **الذین یوتون مااتوا من الفقراء والمساکین** ۔اور خدا کے سامنے حاضر ہوتے ہیں اور وہیں لوٹ کر جاتے ہیں۔ نہ معلوم یہ تمام اعمال منہ پر مار نہ دیے جائیں۔

(آیت ۶۱) ان صفات کے لوگ یعنی مومنین بھلائیوں میں سبقت کرتے ہیں، یہی لوگ ان صفات سے متصف ہو کر بھلائیوں کے کاموں میں بہت ہی سرگرم عمل رہتے ہیں۔اور یہ 'سابق' لوگ ہیں یہ لوگ درجہ کے اعتبار سے آگے آئیں گے۔(آیت ۶۲) ہر شخص پر ذمہ داری اتنی ہے جتنی اس کے اندر قوت و طاقت ہے۔اللہ کی پکڑ اسی کے مطابق ہوگی۔اسی طرح مومنین اپنی استطاعت ہی بھر ذمہ داری کو انجام دیں گے۔اور ان سے پرسش ان کے طاقت و استطاعت کے مطابق ہوگی۔(آیت ۶۳) (بل) ایسی بات نہیں کہ قرآن کے دلائل سمجھ میں نہیں آرہے ہیں، بلکہ یہ غفلت میں مبتلا ہیں اور ان کے اعمال شرک پرستی کے اعمال ہیں۔ قرآن جن اعمال کی دعوت دیتا ہے اس کے خلاف ہے۔(آیت ۶۴) یہ لوگ اس وقت قبول نہیں کررہے ہیں لیکن جب ہم انہیں عذاب سے دوچار کریں گے تو اس وقت یہ حضرات ڈر کر آئیں گے۔(آیت ۶۵) لیکن اس دن ان سے کہا جائے گا، پناہ نہ چاہو اب ہماری طرف مدد نہیں ملے گی۔(من) مقابلے کے لیے آیا ہے۔ **لاتجدون نصیرا** ۔(آیت ۶۶) اعراض کی تصویر بن کر چلتے تھے، استکبار ہر حال میں کرتے رہے، جب دعوت دی جاتی تو وہ الٹے پاؤں لوٹ جاتے۔(آیت ۶۷) ان کے اعراض کی تصویر ہے۔(**مستکبرین**) **تنکصون** سے حال ہے۔اے مشرکین مکہ! تمہارا رویہ اس قسم کا ہے کہ تم رسول کو قصہ گو سمجھتے ہو اور نبی کی دعوت کو حقیر سمجھ کر چھوڑ جاتے ہو، حالانکہ یہ دعوت ایسی نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کرو۔(بہ) رسول کو یا اس قرآن کو۔(القول) **مایقول الرسول** ۔(آیت ۶۸) کیا یہ حضرات رسول کی باتوں پر غور نہیں کرتے یا ان

کے پاس ایسی چیز آ گئی ہو جوان کے آبا کے پاس نہیں آئی۔ یعنی یہ کہ یہ حضرات رسول کی باتوں پر غور وفکر نہیں کرتے اور اس دعوت کو نہیں ماننے کی کوئی دوسری وجہ نہیں ہے کہ ان کے درمیان اب تک کوئی نبی نہیں آیا۔ یہ دونوں وجہیں بے معنی ہیں، یہ حضرات کلام قرآن پر غور کرتے ہیں۔(۲)

حواشی ومراجع

۱۔ نکاح المقت زمانۂ جاہلیت کے اس نکاح کو کہتے تھے جب خاندان میں بڑے لڑکے کا انتقال ہوجاتا تھا تو اس وقت باپ اس کی بیوی سے شادی کرلیتا تھا اور وہ اپنے آپ کو اس سے شادی کے لیے زیادہ حق دار سمجھتا تھا۔ اسی طرح اور بھی دور جاہلیت میں نکاح کا رواج تھا۔ ایک کا نام نکاح 'استبضاع' تھا۔ یہ نکاح شوہر کی اجازت سے کسی اشرافیہ خاندان کے کسی فرد سے ہوتا تھا اور اس سے یہ مقصود ہوتا تھا کہ اس سے ایسی نسل چل پڑے جس میں شجاعت، بہادری، حکمت اور قیادت کی اعلیٰ صفات نمایاں ہوں۔ دور جاہلیت میں دوسرے نکاحوں کا رواج تھا جن میں مخادلہ، البدل، المضامدۃ، الرھط، اصحاب الریات کے نام شامل ہیں۔ ان تمام کو اسلام نے حرام قرار دیا، البتہ نکاح کا یہ طریقہ ضرور رائج تھا جس میں پیغام شادی، ایجاب وقبول، لڑکی یا ولی کی رضامندی، خطبہ نکاح اور مہر کے طے ہونے کے بعد ہی شادی کا انعقاد ہوتا تھا۔ اور یہ عربوں کی شادی کا معروف طریقہ تھا۔ اسے نکاح البعولۃ کہا جاتا تھا البتہ حضرت عائشہؓ نے اسلام سے قبل ہونے والے نکاح کی تعداد کا ذکر چار کیا ہے۔ نکاح بعولہ، نکاح استبضاع، نکاح رھط، اور نکاح الرایات۔ اس کی تفصیل بخاری کتاب 'النکاح باب من قال لا نکاح الا بولی' میں ہے۔

۲۔ بقیہ آیات کی تشریح اور ان کے نوٹس نہیں مل سکے، لگتا ہے کہیں ضائع ہوگئے۔

خوش کلامی

انعام اللہ فلاحی

گفتگو اور بات چیت کے ذریعے انسان کا ایک دوسرے سے رابطہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات و خیالات کو دوسرے انسانوں تک منتقل کرتا ہے۔ باہم ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے ہیں۔ دل و دماغ میں پیدا ہونے والے احساسات و جذبات اور ذہن میں ابھرنے والے اشکالات وسوالات سے باہم واقفیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم اپنی ضروریات اور خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسروں کے مسائل اور الجھنوں کو سمجھ پاتے ہیں۔ اخوت ومحبت، نفرت وتعصب اور تنگ نظری، بھائی چارہ اور تال میل، بیگانگی اور غیریت، دوستی اور دشمنی کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم اپنی زبان کے ذریعے ہی اپنی خوشیوں اور دکھوں، کامیابیوں اور ناکامیوں، آدرشوں اور آرزؤں، زندگی کی تاریکیوں اور محرومیوں، مستقبل کے خوابوں اور عزائم میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔

انسان کی شخصیت کا تعارف اس کی گفتگو اور بات چیت سے ہوتا ہے۔ یہ بات کہی جاتی ہے کہ ارسطو کے پاس ایک شخص بہت اچھا لباس زیب تن کیے ہوئے کافی دیر تک خاموش بیٹھا تھا۔ ارسطو نے اس سے کہا کہ تو میرے ساتھ کچھ گفتگو کر، تاکہ میں تجھے پہچان سکوں۔ تمہاری خوبیوں اور صلاحیتوں سے واقف ہوسکوں۔

شیخ سعدی شیرازیؒ فارسی زبان کے اچھے ادیب اور حکیم ودانا شخص تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب ’ گلستان‘ میں حکمت ودانائی کی بہت ساری باتیں لکھی ہیں۔ اس کتاب میں حکمت کی یہ بات بھی ہے:

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنر نہفتہ باشد

(جب تک انسان گفتگو نہیں کرتا ہے اس کے عیوب اور خوبیاں پوشیدہ رہتی ہیں۔)

گویا گفتگو اور کلام بھی انسان کے تعارف کا ایک ذریعہ ہے۔ اس سے اس کی سوچ اور فکر سے واقفیت ہوتی ہے، اس کے کردار اور اخلاق کا عکس ابھرتا ہے۔ اس سے یا تو لوگوں کے دلوں میں وہ اتر جاتا ہے اور محبوب نظر بن جاتا ہے، یا لوگوں کے دلوں سے اتر جاتا ہے، وہ ناپسندیدہ اور مبغوض ہوجاتا ہے۔ اس لیے گفتگو

کرتے وقت اپنی زبان پر کنٹرول رکھنا چاہیے۔

یہ بات کہی جاتی ہے کہ 'پہلے تو لو پھر بولو'۔ اپنی گفتگو میں جھوٹ، مکروفریب، مبالغہ آرائی، خودستائی، اپنی بڑائی، لوگوں کی خوشامد اور چاپلوسی جیسے امور سے بچتے ہوئے حق اور عدل وانصاف پر مبنی بات کرنی چاہیے۔ کلمہ خیر پر مبنی گفتگو کرنی چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْد (ق:۱۸)

''کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو۔''

جو بھی لفظ منھ سے نکلتے ہیں انھیں ریکارڈ کرنے والے مستعد نگراں ہوتے ہیں۔ منہ سے نکلنے والا لفظ اور کلام، ریکارڈ میں آجانے سے انسان جواب دہی کی پوزیشن میں آجاتا ہے اس لیے اپنی گفتگو میں احتیاط لازمی ہے۔ دورانِ گفتگو اپنے لہجے کو نرم رکھنا چاہیے۔ اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ مخاطب کے دل میں ہماری گفتگو سے اخوت ومحبت، ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ پروان چڑھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْناً (البقرہ۔۸۴)

''لوگوں سے بھلی بات کہنا۔''

لوگوں سے خوش کلامی سے بات کرو، بھلی بات کرو، اندازِ کلام اور گفتگو کا پیرایہ نہایت خوش گوار ہونا چاہیے۔ اس بات کی مسلسل کوشش کے نتیجے میں انسان بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ اس لیے اپنی زبان کو شیریں بنانے اور اسے حسن کے زیور سے آراستہ کرنے سے انسان کو قبولیت عام حاصل ہوتی ہے۔

نرمی اور نرم خوئی انسان کے معاملات کو بہتر بناتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنّ الرفق لا یکون من شئیٍ الازانہ (مسلم)

''نرمی جس کسی چیز میں ہوتی ہے اس کو بہتر بناتی ہے۔''

آپؐ نے فرمایا:

من یحرم الرفق یحرم الخیر کلّہ (مسلم)

''جو شخص نرمی اور شفقت کی صفت سے محروم رہا وہ ہر طرح کے نیکی کے کام سے محروم ہو گیا۔''

منہ سے نکلنے والا لفظ انسان کو عزت بھی دیتا ہے اور اس کے لیے رسوائی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔

خوش کلامی

لفظ ہی پھول بھی ہے لفظ ہی زنجیر بھی

لفظ ہی زخم بھی ہے اور لفظ ہی شمشیر بھی

غیبت، چغلی لایعنی اور فضول باتوں سے بھی انسان کا وزن لوگوں کے درمیان گھٹ جاتا ہے اور اللہ کی نظر میں بھی ناپسندیدہ قرار پاتا ہے۔ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

من کان یو من باللہ والیوم الاخر فلیقل خیرا اولیصمت (متفق علیہ۔ابوھریرہؓ)

''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ جب بات کرے تو بھلی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔''

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایمان کی علامات میں بھلی بات کرنا ہے اور لایعنی باتوں سے بچنا ہے۔

سورۂ مومنون میں مومنین کی کامیابی اور کامرانی کے اوصاف بیان کئے گیے ہیں ان میں ایک وصف یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں، جہاں اس طرح کی لایعنی باتیں ہوتی ہیں ان سے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہیں۔ لایعنی اور بیہودہ باتوں سے انسان کی زندگی دنیا میں عذاب بن جاتی ہے، سماج اور معاشرے میں اس شخص کی وقعت اور قدر و قیمت باقی نہیں رہتی ہے اور آخرت میں بھی اس کے لیے تباہی مقدر ہوتی ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا:

ان العبد لیتکلم بالکلمتہ من رضوان اللہ تعالی ما یلقی لھا بالاً، یرفعه اللہ بھادرجات ، و ان العبد لیتکلم بالکمتہ من سخط اللہ تعالی لایھوی بھابالایھوی بھا فی جھنم (بخاری)

''بندہ اپنی زبان سے خیر کے کلمات اور اللہ کو راضی کرنے والی باتیں کرتا ہے۔ اس کو اپنی بات کی اہمیت اور وزن نہیں معلوم ہوتا ہے حالاں کہ ان ہی باتوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس کے درجات اور مقام کو بلند کر دیتا ہے۔ ایک دوسرا بندہ اللہ کی ناراضگی کی اور لایعنی باتیں کرتا ہے اسے اپنی باتوں کی سنگینی اور خطرنا کی کا اندازہ نہیں ہوتا حالاں کہ وہ انہی باتوں کی وجہ سے جہنم میں گر جاتا ہے۔''

زبان کی یہی خطرنا کی اور سنگینی ہے جس کی وجہ سے رسول ﷺ نے بار بار مختلف اسلوب میں زبان کے مفاسد سے آگاہ فرمایا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ **سئل رسول اللہ ﷺ عن اکثر ما**

یـدخـل الـنـاس الـنـارَ ؟ فقال : الفم و الفرج ، وسئل عن اکثر ما یدخل الناس الجنة فقال : تـقوی الله و حسن الخلق (بخاری) رسول ﷺ سے سوال کیا گیا: وہ کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے زیادہ تر لوگ جہنم میں داخل ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: زبان اور شرم گاہ۔ آپ سے مزید دریافت کیا گیا کہ جنت میں زیادہ تر لوگ کس وجہ سے داخل ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ کا تقویٰ اور حسن اخلاق۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ سے سوال کیا کہ آخرت میں نجات کس طرح ممکن ہے۔ آپؐ نے فرمایا: **امسک عـلیک لسـانک ولیسعک بیتک وابک عـلـی خـطِیْـئتِکَ** (ترمذی) ''نجات ان چیزوں سے ممکن ہے: اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھو، تمہارا گھر لوگوں کے لیے کشادہ ہو، اپنی غلطیوں پر رویا کرو۔''

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان کو اپنے آپ کو خوش گوار گفتگو کا عادی بنانا چاہیے۔ بات چیت میں نرمی اور خوش گواری انسان کو دنیا کی زندگی میں بھی بہت سارے مسائل اور الجھنوں سے نجات دلاتی ہے۔ زندگی کو سعادت و خوش بختی سے ہم کنار کرتی ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی نجات، بھلائی کی باتوں اور لایعنی باتوں سے بچنے میں ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں رسول ﷺ نے توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا ذکر کیا۔ اس کے علاوہ دوسرے اور اہم امور کے ذکر کرنے کے بعد فرمایا: کیا میں تمہیں ان سب کا خلاصہ نہ بتاؤں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ! آپؐ نے اپنی زبان پکڑی اور کہا: اس کو روک کر رکھو۔ راوی نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول کیا ہم لوگ جو بات چیت کرتے ہیں اس کے بارے میں بھی باز پرس ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا اے معاذ! تجھے تیری ماں کھوئے، لوگ اپنے منہ کے بل جہنم میں اپنی زبان کے غلط استعمال کی وجہ سے ڈالے جائیں گے۔ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی زبان کی حفاظت اور بہتر استعمال کا سلیقہ عطا فرمائے، زبان کے انجام بد سے محفوظ رکھے اور خوش کلامی کی توفیق دے۔ (آمین)

ملک وملت کی تعمیر وترقی میں فارغینِ مدارس کا مطلوبہ کردار

محمد طاہر مدنی

مدارسِ اسلامیہ کی تاریخ ایک روشن اور تاب ناک تاریخ ہے۔ بھارت میں انگریزوں کے اقتدار کے بعد ایک بہت بڑا خطرہ جو ملت کو درپیش تھا وہ انگریزی تہذیب وتمدن کی یلغار کا خطرہ تھا۔ حکم راں اپنے ساتھ اپنی تہذیب اور اپنا کلچر بھی لاتے ہیں۔ اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کی شناخت کی بقا کا مسئلہ بہت اہم تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اکابرینِ ملت نے مدارسِ اسلامیہ کا جال بچھانے کا فیصلہ اسی تناظر میں کیا۔ دارالعلوم دیوبند اُم المدارس کی حیثیت سے معرضِ وجود میں آیا۔ رفتہ رفتہ پورے ملک میں مدارس کا قیام عمل میں آیا۔

ان مدارس کے پیشِ نظر بنیادی طور پر دو مقاصد ہیں:

ایک حفاظتِ دین اور دوسرا اشاعتِ دین۔ ایک کا تعلق اندرونِ ملت سے ہے اور دوسرے کا تعلق بیرونِ ملت سے۔

دین کی حفاظت، امت کی اصلاح، نسلِ نو کی تربیت، خواتین میں بیداری، علومِ اسلامیہ کی ترویج، مساجد کی آبادی، مکاتب کا قیام، نوجوانوں میں بیداری، دعوت وتبلیغ اور مختلف زبانوں میں اسلام کے تعارف پر مشتمل کتابوں کی اشاعت کے میدان میں مدارسِ اسلامیہ کی خدمات بہت نمایاں ہیں۔

علما کا مقام ومرتبہ

فارغینِ مدارس امت کے علمائے کرام ہیں۔ انھوں نے قرآن وسنت کا گہرا علم حاصل کرنے میں عمرِ عزیز کا خاصا حصہ لگایا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے علما کو انبیا کا وارث قرار دیا ہے۔ حضرت ابو درداءؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **إن فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب، وإن العلماء ورثة الأنبياء، وإن الأنبياء لم يورثوا دينارًا ولا درهمًا، ورثوا العلم، فمن أخذه أخذ بحظ وافر** ۔(سنن ابوداؤد ۳۶۴۱، سنن ترمذی ۲۶۸۲، سنن ابن ماجہ ۲۲۳،

حدیث صحیح ہے)''عابد پر عالم کی فضیلت اسی طرح ہے جس طرح چودھویں کے چاند کی تمام ستاروں پر ہے، اور علما وارثینِ انبیا ہیں، اور انبیا نے وراثت میں درہم ودینار نہیں چھوڑا بلکہ علم چھوڑا ہے، تو جس نے اسے حاصل کیا اس نے بڑا قیمتی ورثہ پالیا''۔ اس سے علما کا مقام ومرتبہ بھی معلوم ہوتا ہے اور ان کی عظیم ذمہ داری بھی واضح ہوتی ہے۔ انھیں کارِ نبوت کو انجام دینا ہے۔

اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ علما سے مراد وہ مخلص علما وفارغین ہیں جو شریعت کا گہرا علم اور دینی بصیرت رکھتے ہیں، تفقہ فی الدین کی دولت سے بہرہ ور ہیں، کردار کی عظمت جن کی پہچان ہے اور جنہیں اللہ نے حکمت ودانائی کا خزانہ عطا فرمایا ہے۔ صرف سند یافتہ حضرات ہرگز مراد نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا [البقرۃ:٢٦٩]

''جسے حکمت کا خزانہ مل گیا، اسے خیر کثیر کی دولت نصیب ہوگئی''۔

ایسے علماے ربانیین اللہ کے برگزیدہ ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين. (صحیح بخاری:۷۱، صحیح مسلم:۱۰۳۷)''اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے تفقہ فی الدین کی دولت عطا کر دیتا ہے''۔

ملت کا علما سے رشتہ

ملت کا رشتہ علما سے بہت گہرا ہے۔ دینی رہنمائی اور مسائلِ حاضرہ کی عقدہ کشائی کا فریضہ یہی انجام دیتے ہیں۔ ہدایتِ ربانی: فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ [النحل:۴۳، الانبیاء:۷] پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ملت کے افراد ان سے پیش آمدہ مسائل میں رجوع کرتے ہیں اور عملی رہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔ ایک تفسیر کے مطابق: أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ [النساء:۵۹] میں اولوالامر سے مراد اہلِ علم ہیں۔

ملت کو علما سے برگشتہ کرنے کی سازش بہت قدیم ہے۔ بہت چالاکی کے ساتھ اِس وقت اِس پر خاص توجہ مرکوز ہے کہ کسی طرح علما سے وابستگی کمزور ہو جائے۔ اس میں کچھ علما کی کوتاہی کا بھی دخل ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک گہری سازش ہے۔ ملت دینی رہ نمائی اپنے علما سے حاصل کرتی ہے، جب ان سے بدظن ہو جائے گی تو دین سے رشتہ کمزور ہو جائے گا اور اسے غلط راستوں پر لے جانا آسان ہو جائے گا۔

مطلوبہ کردار

مدارسِ اسلامیہ کے فارغین سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ خاص طور سے موجودہ نازک دور میں بھارت کے تکثیری معاشرے میں ایک نئے ویژن کے ساتھ انھیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں اور ملک وملت کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرنا ہے۔ اس کے لیے رسوخ فی العلم، فکر کی پختگی، نصب العین کے ادراک، شریعت کی مہارت، تحقیقی مزاج اور صلابتِ کردار کی ضرورت ہے۔ ان کا بنیادی کردار دینی رہ نمائی ہے جس کے لیے عصرِ حاضر میں انفارمیشن ٹکنالوجی کا حسنِ استعمال ضروری ہے۔ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور آج کے چیلنج بے شمار ہیں۔ ذیل میں الگ الگ تناظر میں ان کے مطلوبہ کردار کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔

اندرونِ ملت

۱۔ **دینی بیداری اور تربیت وتزکیہ**: فارغینِ مدارس کی اہم ترین ذمہ داری ملت کی تربیت، تزکیہ اور وسیع پیمانے پر دینی بیداری پیدا کرنا ہے۔ ملت کی اساس ہی ایمان وعقیدہ ہے، دین ہی بنیاد ہے۔ دین سے رسمی اور نسلی تعلق کو ایک زندہ تعلق اور گہری وابستگی میں بدلنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر اہلِ ایمان کا کردار بحال نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے تمام میسر ذرائع کا اچھا استعمال کرنا ہوگا۔ درس، تذکیر، خطبہ، تقریر، تحریر اور دیگر وسائل کا استعمال کرنا ہوگا۔ تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت کے ذریعے تزکیہ کے مقصد کا حصول ہی انبیائی طریقہ ہے۔

۲۔ **فروغِ تعلیم**: دوسرا کام جو فارغینِ مدارس کو اندرونِ ملت انجام دینا ہے وہ فروغِ تعلیم کا اہم کام ہے۔ جس قوم کی پہچان ہی علم وتعلّم ہے اس کی پیشانی پر تعلیمی انحطاط کا داغ بہت بدنما لگتا ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے حصولِ علم کا شوق پیدا کیا اور شتربانوں کو علم کا امام بنا دیا، اسی طرح حصولِ علم کا شوق پیدا کرنا، علمی مراکز قائم کرنا، تعلیم کو عام کرنا اور ناخواندگی کا خاتمہ کرنا فارغین کی ذمہ داری ہے۔

۳۔ **مساجد کے کردار کا احیا**: اسلامی معاشرے میں مسجد کی حیثیت مرکزی ہے۔ مسجد عبادت گاہ بھی ہے اور تعلیم گاہ بھی۔ مسجدِ نبوی متنوع سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ آج مساجد کا کردار بہت محدود ہوگیا ہے، ان کی تزئین وآرائش تو ہو رہی ہے لیکن ان کی افادیت کا دائرہ بہت محدود ہوگیا ہے۔ از سر نو مساجد کے وسیع کردار کی بحالی کی ضرورت ہے اور اس تعلق سے فارغینِ مدارس اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

۴۔ **نوجوانوں پر توجہ**: نوجوان ہماری قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کے اندر بے پناہ قوت وصلاحیت ہوتی

ہے۔ ان کی ایمانی وروحانی تربیت اور اخلاقی تعمیر بہت ضروری ہے۔ ان پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ فارغینِ مدارس ان کے لیے اگر فہمِ قرآن مجید کی کلاسوں کا اہتمام کریں اور ان کے اندر قرآن مجید سے شغف پیدا کردیں تو ان کی سیرت میں نکھار پیدا ہوجائے گا اور ملت کے لیے وہ بہترین سرمایہ ثابت ہوں گے۔

۵۔ **ذرائع ابلاغ پر توجہ**: آج ذرائع ابلاغ نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور اب سوشل میڈیا نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ ان ذرائع کا حسنِ استعمال فارغین کے لیے ضروری ہے تاکہ دعوت واصلاح اور تعلیم وتربیت کا کام وسیع پیمانے پر انجام پائے۔

۶۔ **معاشی استحکام پر توجہ**: ملت کی معاشی حالت بہت خراب ہے۔ غربت اور بے روزگاری عام ہے۔ فقر وفاقہ ایسی چیز ہے جو کفر تک پہنچادیتی ہے۔ مسلم معاشرے میں بیت المال کا نظم، زکاۃ وصدقات کی اجتماعی تحصیل اور مصارف میں صحیح استعمال بہت ضروری ہے۔ لوگوں کو اپنے پیر پر کھڑا کرنے کی تدابیر اور سرکاری اسکیموں سے باخبر کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ مساجد کے نظم کے تحت اس طرح کے امور انجام دیے جاسکتے ہیں اور گاؤں کی سطح پر انتظام کے لیے آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

۷۔ **اصلاحِ معاشرہ**: آج ہمارا معاشرہ طرح طرح کی سماجی برائیوں کی لپیٹ میں ہے۔ فضول خرچی، رسوم ورواج کے بندھن، منشیات کی عادت، جوا، فحاشی اور چوری وغیرہ نے سماج کو کھوکھلا بنادیا ہے۔ برادرانِ وطن ہمارے دین کے بارے میں رائے ہمارے سماج کو دیکھ کر قائم کرتے ہیں۔ دعوتِ دین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہمارا بگڑا ہوا سماج ہے۔ اس کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش فارغینِ مدارس کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔

۸۔ **فیملی کونسلنگ**: عائلی زندگی کے مسائل کو حل کرنا اور خاندانی زندگی کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے کونسلنگ کے مراکز کا قیام ضروری ہے۔ فارغینِ مدارس قرآن وسنت اور جدید تحقیقات کی روشنی میں مناسب مشورے دے کر خاندان کو بکھرنے سے بچاسکتے ہیں۔ بہت سارے معاملات میں اگر صحیح کونسلنگ ہوجائے تو طلاق وتفریق کی نوبت نہ آئے۔ یہ ایک بہت بڑی سماجی خدمت ہے۔

۹۔ **جمعہ کا حسنِ استعمال**: اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی مشروعیت کے ذریعے ملت کی تعلیم وتربیت اور اسے بیدار رکھنے کا ایک بہت کارگر اور مؤثر ذریعہ فراہم کیا ہے۔ جمعہ کا نظام ایک منفرد نظام ہے جس کی نظیر دیگر سماجوں میں نہیں ملتی ہے۔ نیز جمعہ ایک ایسا منبر ہے جس کے ذریعے بہت آسانی سے ہم پوری آبادی میں بہترین

پیغامات کی ترسیل کر سکتے ہیں۔افسوس کی بات ہے کہ آج جمعہ کے خطبات اور بیانات کا صحیح استعمال نہیں ہو پا رہا ہے۔ فارغینِ مدارس اگر سنجیدگی سے اس پر توجہ دیں اور منظّم طریقے سے اس کا استعمال کریں تو ملت میں ایک انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے خطباتِ جمعہ وعیدین کا اگر تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح وہ بروقت تذکیر وہدایات پر مشتمل ہوتے تھے اور ان کے ذریعے کتنی مؤثر تعلیم وتربیت کا اہتمام ہوتا تھا۔

۱۰۔سیاسی بیداری: کوئی قوم اپنے ملک کے حالات سے بے تعلق رہ کر ترقی نہیں کرسکتی۔ ملک کی سیاسی تربیت بھی بہت ضروری ہے۔ ملک کس رخ پر جارہا ہے، ہمارا سیاسی لائحۂ عمل کیا ہونا چاہیے، کس طرح ہم اس میدان میں مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں، ہمارا سیاسی پروگرام کیا ہونا چاہیے، برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر عدل وقسط کے قیام اور ظلم وعدوان کے ازالے کے لیے ہم کس طرح اپنا رول ادا کرسکتے ہیں؟ اس کی تربیت بہت ضروری ہے۔ نبی کریم ﷺ داعی ومربی اور معلّم ومزکی کے ساتھ ایک بہترین حکم راں بھی تھے۔ آپ کا طریقۂ سیاست ہمارے لیے اسوہ ونمونہ ہے۔ ہماری سیاست اسوۂ نبوی سے بیگانہ نہیں ہوسکتی۔ ملت کی سیاسی تربیت بھی فارغین کی ذمہ داری ہے۔

بیرونِ ملت

۱۔ برادرانِ وطن سے روابط: برادرانِ وطن سے اچھے روابط کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم ایک تکثیری معاشرے میں رہتے ہیں، برادرانِ وطن سے کٹ کر رہنا ممکن نہیں ہے۔ان کے ساتھ اچھے مراسم ہوں، سماجی تعلقات ہوں، اپنائیت ہو، ہم ان کے لیے اجنبی نہ ہوں، فارغینِ مدارس کو اس پر توجہ دینی چاہیے۔ کس طرح سے نبی کریم ﷺ نے مختلف قبائل سے تعلقات استوار کیے، گہرے روابط بنائے اور ان کے دکھ درد میں شرکت کی، اسے ہمیں سامنے رکھنا ہوگا۔

۲۔دعوتِ اسلامی: سب سے اہم کام جو برادرانِ وطن میں ہمیں انجام دینا ہے وہ دعوت الی اللہ کا کام ہے، اسلام کا پیغامِ رحمت ان تک پہنچانا ہے۔ یہ ملت کا فرضِ منصبی ہے اور انسانیت کے ساتھ محبت کا تقاضا ہے۔انسانوں کو جہنم سے بچانا اور ان کو راہِ جنت پر لانے کی کوشش کرنا انبیا کی عظیم ترین سنت ہے، یہی ان کا مشن ہے۔اس لیے وارثینِ انبیا کی ذمہ داری ہے کہ غیر مسلم بھائیوں تک دردمندی کے ساتھ اسلام کی دعوت پہنچائیں اور اس کارِ عظیم کے لیے تمام وسائل کا استعمال کریں۔

۳۔مواسات وہمدردی: خلقِ خدا سے محبت ایمان کا تقاضا ہے۔جواللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ بندگانِ خدا کی خدمت کرتا ہے۔خدمتِ خلق کا کام وسیع پیمانے پر کرنے کے لیے ملت کوآمادہ کرنا ضروری ہے۔

۴۔اشتراک وتعاون: ملکی مفاد کے کاموں میں برادرانِ وطن کے اشتراک کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔انسانیت کی فلاح وبہبود کے کاموں میں تعاون کرنا چاہیے۔روابط بڑھانے کا بھی یہ ایک اہم ذریعہ ہے۔

ملکی تناظر میں

ا۔ملکی مسائل سے دل چسپی: ہم اپنے ملک کے مسائل سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ہماری شناخت یہ نہیں ہونی چاہیے کہ ہمیں صرف ملّی مسائل سے ہی دلچسپی ہے۔فارغینِ مدارس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ملکی مسائل سے پوری دل چسپی رکھیں اور ملت کوآمادہ کریں کہ ملکی مسائل کے حل میں تعاون کرے۔

۲۔ اصلاحِ سیاست: ملک میں سیاست کی سطح انحطاط پذیر ہے۔ اقدار پر مبنی سیاست عنقا ہے۔ مفاد پرستی اور بدعنوانی کا دور دورہ ہے۔ظلم واستحصال بڑھتا جا رہا ہے۔اگر اصلاح کی کوشش نہ کی گئی تو ملک تباہی سے دوچار ہوگا۔اسے بچانے کی فکر کرنا ضروری ہے۔انصاف پسند لوگوں کے ساتھ سیاست کی اصلاح کی کوشش لازمی ہے۔

۳۔جمہوری اداروں کے بقا کی کوشش: ملک کے دستور کی بنیاد جمہوریت اور سیکولرزم پر ہے۔یہ بنیادیں کمزور کی جا رہی ہیں۔جمہوری ادارے کمزور ہو رہے ہیں۔دستور کی روح کے خلاف قانون سازی ہو رہی ہے۔تازہ مثال CAA ہے۔فارغینِ مدارس کی ذمہ داری ہے کہ اس تعلق سے ملت کے اندر بھی بیداری پیدا کریں اور برادرانِ وطن کے ساتھ بھی اشتراک وتعاون کریں،تاکہ فسطائیت کو روکا جا سکے۔

ملک وملت کے تناظر میں فارغینِ مدارس کے مطلوبہ کردار کے تعلق سے چند امور کا تذکرہ یہاں کیا گیا ہے۔دراصل فارغینِ مدارس کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔باہمی تعاون واشتراک اور اجتماعیت کے ساتھ یہ بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔بلند نگہی اور اولوالعزمی درکار ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر، میرِ کارواں کے لیے

اللہ تعالیٰ فارغینِ مدارس کو میرِ کارواں کا کردار ادا کرنے کی توفیق بخشے،آمین۔

سلفیت اور تحریک اسلامی کا سنگم
(ضلع بستی میں تعلیم وتربیت کے دو سال)

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

ناظر تعلیمات کا محاسبہ

دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے ناظر تعلیمات مولانا عبدالشکور دور صدیقیؒ (۱۹۱۴-۱۹۹۸ء) کا طوفان خیز دورہ اور مدرسہ رحمانیہ بجوا کلاں ضلع گونڈہ (اور اب ضلع بلرام پور) کے طلبہ واساتذہ کا معائنہ ومحاسبہ اب تک یاد ہے۔ میں درجہ دوم کا طالب علم تھا۔ وہ مدرسہ کے احاطے میں داخل ہوئے تو شام کو چھٹی کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اساتذہ مطمئن تھے کہ معائنہ کی کارروائی اب خانہ پری تک محدود رہے گی۔ وہ دور صدیقی کے طریقۂ تفتیش سے خائف تھے۔ انھوں نے حکم دیا جو بچے احاطے میں موجود ہیں انھی کو بلایئے۔ میری ذہانت ومحنت پر اساتذہ کو بھروسہ تھا۔ انہوں نے مجھے آگے کردیا۔ 'ہماری کتاب' کا صفحہ کھولا تو 'سورج' کے عنوان سے مضمون سامنے آ گیا۔

ناظر تعلیمات نے پڑھنے کا حکم دیا۔ طلوعِ آفتاب کی شکل کو تھالی کی طرح گول بتایا گیا تھا۔ دور صدیقی نے ٹوک دیا:

یہ تھالی کیا ہے؟ کبھی تم نے اسے دیکھا ہے؟

میرے حواس گم ہوگئے۔ خاموشی میں عافیت سمجھی۔ انھوں نے تاڑ لیا کہ الفاظ کے معنی نہیں بتائے گئے ہیں۔ محض خواندگی کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ انھوں نے اردو کے استاد کے خلاف رپورٹ لکھی اور اگلے سال استاد کو تدریس سے فارغ کردیا گیا۔

میں نے گھر جا کے ابا کو ماجرا سنایا۔ انہوں نے دور صدیقی کی ایمان داری اور لیاقت وصلاحیت کی تعریف کی اور انھیں اپنے کرم فرما احباب میں شمار کیا۔ گاؤں میں مکتب کی تعلیم مکمل ہوئی تو ابا نے بیس پچیس کلومیٹر دور ضلع بستی (اور اب سدھارتھ نگر) میں واقع مدرسہ اسلامیہ اکرہرا میں داخلہ لینے کا عندیہ دیا اور وجہ یہ

بتائی کہ مولانا دورصدیقی وہاں استاد ہیں۔ان کی نگرانی میں بہترتعلیم وتربیت ہوگی۔

مولانا دورصدیقی بیت نار ضلع بستی کے ایک اہل حدیث خانوادہ کے جید عالم تھے۔انھوں نے مولانا زین اللہ طیب پوری کے ساتھ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس نوگڑھ ۱۶۔۱۹ر نومبر ۱۹۶۱ء میں شرکت کی تھی اور شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوریؒ سے جماعت اسلامی میں شمولیت کی بابت استصواب کیا تھا۔ان کی منظوری ملنے کے بعد باقاعدہ جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے تھے۔یہ بات ابا نے مجھے بتائی اور بعد میں مولانا دور صدیقی کے صاحب زادے ڈاکٹر انور کمال فلاحی نے اس کی تصدیق کی۔

مجھے اس وقت جماعت اسلامی سے کوئی دل چسپی تھی نہ اس کے بارے میں کوئی معلومات تھیں۔ابا کی دین داری اوران کی اسلامی زندگی ہی جماعت اسلامی کے تعارف کا ذریعہ تھی۔ابا نے ہی بتایا کہ مدرسہ اسلامیہ اکرہرا میں جماعت اسلامی کے ایک اور معزز رکن مولانا محمد صدیق (گورکھ پوری) بھی معلم ہیں۔نظم وضبط کی پابندی میں مثالی ہیں۔

مدرسہ اسلامیہ اکرہرا اور کھجوریا کے اہل حدیث رئیسوں کے جذبۂ انفاق کا مظہر تھا۔اس کی عمارت اکرہرا گاؤں سے باہر تالاب کے قریب کھلے میدان میں واقع تھی۔مستقل اقامت گاہ نہ تھی۔باہر کے طلبہ دونوں بستیوں کے رؤسا کے ذاتی مکانات میں رہتے تھے اوران کے کھانے کا انتظام اہلِ خیر اور اہلِ ذوق مسلمانوں کے تعاون سے ہوتا تھا۔طلبہ باری باری مختلف گھروں پہ کھانا کھاتے تھے۔اس نظم میں بعض دوسرے مواضعات کے مسلمانوں کا تعاون بھی شامل تھا۔۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے دوسال یہاں میں نے بسر کیے۔

اکرہرا میں مرحوم حاجی ضیاء اللہ کا اور کھجوریا میں مرحوم محمد ادریس خان کا مکان طلبہ کی رہائش کے لیے وقف تھا۔یہ دونوں گھرانے دینی جذبے سے سرشار تھے۔اپنی رئیسانہ وجاہت اور سیاسی اثر ورسوخ کے ساتھ دینی تعلیم کے فروغ کے لیے سینہ سپر رہتے تھے۔ادریس خان ہی کے مکان میں صدر مدرس مولانا عبدالحمید شفیقی کی بھی رہائش تھی۔وہ رشتے میں ان کے ہم زلف بھی تھے۔

ممتا کی سوغات

تعلیم کی غرض سے گھر سے باہر اقامت گزینی کا عمل خاندان میں بڑے استعجاب کے ساتھ دیکھا گیا۔ پورے محلے میں یہ خبر بحث ومباحثہ کا موضوع بنی۔مردوں نے عام طور سے سراہا۔بعض خواتین نے دل کی بھڑاس نکالی۔ہمارے ہم مکتب جمیل احمد کی ماں نے طنز کیا:''بھوجی کے چھ بچے ہیں۔انھوں نے ایک بچے کو

گھر سے باہر پڑھنے کے لیے بھیج دیا تو انھیں قلق نہ ہوا۔ میرا ایک ہی لال ہے میں اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں گی چاہے وہ جاہل رہ جائے۔'' ہماری سوتیلی دادی کا انداز ہی نرالا تھا:'' گھر میں کھانے کو غلہ نہیں ہے۔اس کا باپ اعلیٰ تعلیم کا خواب دیکھ رہا ہے۔اسے بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے گی۔''

ان تیروں کا ہدف تھا اماں کی ذات۔ وہ ان سوہانِ روح تبصروں کو کیسے برداشت کرتی تھیں، اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہمارے گھر میں ابا الحاج عبارت حسین خان نے ایسا ماحول بنا رکھا تھا کہ تعلیمی فضائل کے انبار تلے ماں کی سسکیاں دب کر رہ جاتی تھیں۔اماں کو بچوں پر فخر و ناز تھا۔اس کا اظہار ان سوغاتوں سے ہوتا جو گھر سے رخصت ہوتے وقت وہ میرے بیگ میں رکھ دیتی تھیں۔

اکرہرا کے مدرسہ اسلامیہ کے لیے اولین روانگی ہوئی تو اماں نے چاول کے آٹے کا لڈو بنا کر دیا، جس میں شیرینی کے علاوہ بعض دوسرے عناصر کثیر مقدار میں شامل ہوتے۔لڈو کی خاصیت یہ ہوتی کہ کافی دنوں تک خراب نہ ہوتا۔ ناتجربہ کاری اور احباب کی دل جوئی میں ایک ماہ کا سامانِ لذت ایک ہفتہ میں ختم ہوگیا۔ ڈھنکھر پور کے محمد اسرائیل کو اپنے گاؤں جانا ہوا تو چھٹی لے کر میں بھی روانہ ہوگیا۔اسرائیل مجھے ترلوک پور کی پکی سڑک پار کر کے واپس چلے گئے وہاں سے گھر کا راستہ محض تین چار کلومیٹر تھا اور میرے لیے مانوس بھی۔ میں سکون سے اماں کی قدم بوسی کے لیے جا حاضر ہوا۔ پہلے تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا اور پھر لمحوں میں مجھے گلے لگا کے سسک پڑیں۔جیسے مدتوں بعد ان کا بیٹا مشرق وسطیٰ کے کسی طویل سفر سے واپس آیا ہو۔

دو دن قیام کے بعد مدرسہ کے لیے روانگی کا وقت آیا تو میرے سارے کپڑے اماں نے دھو کر بیگ میں رکھ دیے تھے۔ان کی آنکھیں پھر جھل مل کرنے لگیں۔انہوں نے حسرت و یاس کے ساتھ پھر مجھے رخصت کیا اور تاکید کی کہ سامان لذت کا استعمال احتیاط کے ساتھ کروں۔سردی کا موسم آیا تو بڑی بہن زمرد خاتون نے اپنے زنانہ جوتے دے دیے اور اپنا نیلا دوپٹہ لپیٹ کر مفلر کی طرح سوئی سے سی دیا کہ کانوں کی ہوا سے حفاظت ہو سکے۔میری مفلوک الحالی ہم درس ساتھیوں کے مذاق واستہزا کا موضوع بنتی مگر مجھے کبھی اپنی عسرت اور تنگ دستی کا احساس تک نہ ہوا۔ میں اپنی قلندری میں مست لوح وقلم سے رشتہ استوار کیے رہتا۔ مجھے دوسرے طلبہ کی امارت اور شوکت سے کبھی حسد یا رقابت محسوس نہ ہوتی کیوں کہ میں لیاقت اور نظم کی پابندی میں مثالی تھا اور اساتذہ کی آنکھوں کا تارا بھی۔

کھجوریا میں مرحوم محمد ادریس خان کی حویلی کا برآمدہ ہماری جائے قرار تھی۔صندوق اندر کمرے میں

رہتا۔ جاڑوں میں ہم کمرے کے اندر منتقل ہو جاتے اور دھان کی پوال زمین پر بچھا کے اپنا بستر لگا لیتے۔ ناشتہ اور ظہرانہ وعشائیہ کے لیے دو مسلمان گھروں کا طواف کرتا۔ ایک ہفتہ جناب فراست علی کا مہمان ہوتا اور دوسرا ہفتہ محمد ناظر حجام کا۔ ان دونوں گھرانوں کا احسان زندگی بھر مجھے یاد رہے گا۔

حجام کی مہمان نوازی

جناب فراست علی کاشت کار تھے اور قدرے خوش حال بھی۔ ان کی اہلیہ بااخلاق تھیں اور بیٹی بھی۔ ان کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کے میں نے ان کی بیٹی کو عصر تا مغرب مہینوں ہوم ورک کرایا۔ سامنے ایک ہندو بڑھئی کی چھت پر، ہم دونوں لکڑی کی سیڑھی کی مدد سے چڑھ جاتے اور ایک گھنٹہ کام کر کے واپس آ جاتے۔ چھت پر ہواخوری بھی ہو جاتی۔ تاہم اس گھر میں فراست علی کی ساس کی موجودگی بلائے جان تھی۔ وہ عورت دل کی بھی سیاہ تھی۔ سخت مزاجی اور درشت گوئی اس کی نمایاں صفت تھی۔

ناشتہ میں روٹی ملتی۔ میں انتظار کرتا کہ دال سبزی یا چٹنی آ رہی ہے۔ ساس تاک میں رہتی نشتر زنی کے لیے۔ تڑاق سے بولتی:

''توے سے اتری ہوئی گرم گرم روٹی ہے۔ نگل جاؤ۔ دال یا سبزی کا انتظار مت کرو۔''

میں دسترخوان سے اٹھ جاتا اور کمرے میں واپس آ کر اماں کے دیے ہوئے حلوے سے بھوک مٹاتا۔ ایک مہینہ کے بعد جب گھر واپس آیا اور اماں سے اپنی درگت بیان کی تو انھوں نے آم کا اچار بنایا اور مرتبان میرے حوالے کر دیا۔ اب ناشتہ کے وقت میں ایک کاغذ میں لپیٹ کر اچار لاتا اور سوکھی روٹی سے اسے استعمال کرتا۔ ان کی ساس سے یہ برداشت نہ ہوا۔ ایک دن پھر نیش زنی کی:

> ''یہاں پڑھنے آئے ہو یا مستی کرنے آئے ہو۔ گرم سوکھی روٹی تمہارے حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ گھر سے اچار لے کر چلے ہو۔ اپنی ماں سے شکایت کرتے ہو گے کہ مجھے بھوکا رکھا جاتا ہے۔ اچار لائے ہی تھے تو ہماری لیے بھی ایک ڈبہ لے آئے ہوتے۔''

ظہرانہ میں اکثر وہ بزرگ خاتون پلیٹ میں نیچے شبینہ چاول رکھتیں اور اوپر سے تازہ چاول بکھیر دیتیں۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہوتی۔ باسی اور تازہ چاول ملا کر قابلِ استعمال ہو جاتا۔

ایک ماہ بعد جب گھر واپسی ہوئی تو اماں نے اچار کے دو مزید ڈبے دونوں گھروں کے لیے تحفے میں دیے، مگر اس عورت کی نشتر زنی نہ رکی۔

دوسرا ہفتہ جناب محمد ناظر حجام کے پاس طواف میں گزرتا۔ وہ بال کاٹنے کے علاوہ ہفتہ میں ایک بار بکرا ذبح کر کے گوشت فروخت کرتے تھے۔ طبعی طور پر گھر میں بھی اس دن گوشت کا اہتمام ہوتا۔ جاڑوں میں مچھلی بھی پکائی جاتی۔ وہ خود خلیق اور پرمزاح تھے۔ ان کی اہلیہ بار بار کہتیں کہ تم مجھے اپنی بڑی بہن سمجھ لو۔ بڑے تپاک سے ملتیں۔ محبت اور خلوص کا مظاہرہ کرتیں۔ ناظر مرحوم کی والدہ بھی حسن سلوک اور حسن معاشرت کا وطیرہ اپناتیں۔ میرے گھر کا حال احوال پوچھتیں۔ مہینے کا پہلا ہفتہ کلفت میں گزرتا تو دوسرا راحت میں۔ اس طرح توازن پیدا ہو جاتا۔

محمد ناظر مرحوم کے مکان سے متصل ہم جماعت محمد صغیر انصاری کا خاندان آباد تھا۔ یہ لوگ درزی تھے، مگر شفقت و محبت سے پیش آتے۔ صغیر کی بھابھی اپنائیت کا مظاہرہ کرتیں۔ بسا اوقات سر میں تیل کا مالش بھی کر دیتیں۔ تناول ماحضر سے تواضع ان کا معمول تھا۔ ہم دونوں ہم جماعت ساتھ میں مدرسہ کا رخ کرتے۔

کبوتر خانہ میں کالا ناگ

دوسالہ اقامت کے دوران چند واقعات ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان میں ایک کالا ناگ کو مارنے کا واقعہ بھی ہے۔ کھجوریا کے رئیس مہدی حسن خاں مرحوم کے کبوتر خانہ میں ایک صبح سارے کبوتر مردہ پائے گئے۔ پڑوسی محمد اقبال خان کی مدد حاصل کی گئی۔ انھوں نے صورت حال دیکھتے ہی سانپ کی موجودگی بھانپ لی۔ وہ اکیلے لمبا برچھا لے کر کمرہ کے اندر گھس گئے۔ دو گھنٹوں کی جستجو کے بعد انھوں نے سانپ کے جسم میں برچھا مار کے اسے باہر نکال لیا۔ وہ کالا ناگ تھا۔ چار فٹ سے بڑا تھا۔ بار بار پھنی مارتا۔ دیکھنے والے دہشت زدہ ہو جاتے۔ ایک لمبی نمائش کے بعد آخرکار اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

اقبال خاں ہم جماعت گوہر خان کے چچا تھے۔ دلیر اور بے خوف۔ سانپ پکڑنے اور مارنے کا انھیں شوق تھا۔ اپنے اس شوق کی وجہ سے اکثر طلب کیے جاتے اور محض خدمت کے جذبے سے وہ لوگوں کے یہاں حاضری دیتے تھے۔

اس دور کا ایک اور واقعہ زیورات کی دن دہاڑے چوری کا ہے۔ برقعہ پوش خواتین کی ایک جماعت نے یہ حرکت کی تھی۔ کھجوریا ہی کے محمد ادریس خان مرحوم کے اہل خانہ کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔ گھر کے اندر مرد نہیں تھے صرف خواتین تھیں۔ نو وارد اجنبی عورتوں نے بڑے مہذب طریقہ سے گفتگو اس انداز میں کی کہ اہل خانہ مسحور سے ہو گئے۔ ایک گھنٹہ کی ملاقات میں انہوں نے گھر کے سارے زیور یکے بعد دیگرے لا کر جمع

کر دیے۔ برقع پوش خواتین تھوڑی دیر میں چمپت ہوگئیں۔ چھت کے اوپر سے پڑوسی کی بیٹی یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔اس نے شور مچایا کہ زیورات کیوں فروخت کیے گئے ہیں۔ایک گھنٹہ بعد اہلِ خانہ کو ہوش آیا۔

تھانہ ڈھبروا میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ علاقے کے رئیس کے گھر میں یہ حادثہ ہوا تھا اور زیورات کی مالیت بھی لاکھوں میں تھی۔ پولیس حرکت میں آ گئی۔ بڑھنی بازار کے اطراف میں خیمہ زن بنجارے مشکوک قرار پائے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں اسی طرح کا ایک اور حادثہ شہرت گڑھ میں رونما ہوا۔ پولیس نے اپنے مخبر دوڑائے۔ آخر کار بنجارہ عورتیں پکڑی گئیں اور تمام زیورات برآمد ہو گئے۔ علاقہ میں یہ بہت بڑی واردات انجام دی گئی تھی اس لیے اس کا شہرہ خوب ہوا۔

ادریس خان مرحوم ڈیوڑھی کے سامنے تعمیر شدہ چبوترے پر عصر کے بعد بیٹھتے تھے۔ ہندو مسلمان سب ان کے گرد جمع رہتے۔ وہ مدتوں مزے لے لے کے اس واقعہ کو سناتے رہے۔ طلبہ بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق نمک مرچ لگا کے اسے بیان کرتے۔ یہ خوش گپیاں اس وقت عمل میں آتیں جب مولانا عبدالحمید شفیقی اپنے کمرے میں موجود نہ ہوتے۔

قیام گاہ میں بیت الخلا نہ ہونے کے سبب بڑی دقّت پیش آتی۔ رفع حاجت کے لیے طلبہ عام آدمیوں کی طرح اپنے لوٹے لے کر کھیتوں میں جاتے۔ برسات کے دنوں اور سرما کی راتوں میں اس فطری ضرورت کی تکمیل کی بڑی قیمت چکانی پڑتی۔ ایک بار موسم سرما کی ایک سرد رات میں میرا پاؤں پھسل گیا اور میں نالے میں جا گرا۔ کپڑے بھیگ گئے۔ دوسرے دن بخار چڑھا اور کئی دنوں تک بے خوابی کی شکایت رہی۔

قوتِ مسلم کا مخزن

مدرسہ اسلامیہ اکرہرا میں سالِ اول کی تدریس یادگار رہے۔ مولانا عبدالشکور دور صدیقی مرحوم نے ہماری کتاب حصہ ششتم کے منتخب ابواب کا درس دیا۔ وہ بلند آواز، بارعب، وسیع النظر معلم تھے اور مسلک سلف پر بغیر ادنیٰ مداہنت کے گامزن مبلغ تھے۔ جماعت اسلامی سے تعلق اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں کے مطالعہ نے انھیں احیائے اسلام کا وکیل اور ترجمان بنا دیا تھا۔

دور صدیقی درس دیتے وقت پورا جسم متحرک رکھتے۔ ہنستے تو قہقہہ کی آواز دور تک گونجتی۔ ڈانٹتے تو طلبہ پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ میں نے انھیں اپنے گاؤں میں اور اپنے گھر میں دیکھا تھا اس لیے ان سے انسیت ہو گئی تھی۔ ان کا طریقۂ تدریس دلچسپ ہوتا۔ طلبہ ہمہ وقت متوجہ رہتے۔

ہماری کتاب اول تا ششتم مولانا افضل حسینؒ کی مرتب کردہ درسی کتاب ہے۔ زبان معیاری ہے۔ اس میں اسلامی ادبی ذوق کی کارفرمائی ہے۔ مضامین کا انتخاب اس طرح کیا گیا ہے کہ طالب علم اسلام کے انقلابی پیغام سے واقف ہی نہیں، اس کا علم بردار بنے اور معاشرہ کی اصلاح کی آرزو اس کے اندر کروٹیں لینے لگے، اسی لیے بہت مقبول ہے۔

۴ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو ابا نے بتایا کہ بعض اہل حدیث علما نے 'ہماری کتاب' کو شامل درس کرنے پر اعتراض کیا۔ وجہ بتائی کہ وہ بہت مشکل ہے اور طلبہ کی عمومی سطح سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مدرسہ کے ذمہ داران تک یہ شکایت پہنچی تو حاجی محمد احمد معروف بہ چراغی بابا نے یہ کہہ کے ان کا مطالبہ مسترد کردیا کہ ہمیں اپنے مدرسہ کا معیار بلند کرنا ہے اور زوال کی کسی منطق کو ہم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

مولانا عبدالشکور دور صدیقی نے ہمیں ایک نظم پڑھائی اس کا عنوان تھا:

طاقت مسلم

مسلمانوں کے دورِ زوال میں رومی بادشاہ رتبیل سے جزیہ طلب کیا گیا تو اس نے دینے سے انکار کردیا۔ دور اول کے مسلمان کردار کے غازی تھے بعد میں وہ گفتار کے غازی بن کے رہ گئے۔ پہلے ان کے اندر غربت تھی مگر وہ بے نیاز اور غیور وجسور تھے۔ بعد میں وہ قارونی خزانوں کے مالک بن گئے مگر ان کی غیرت وجسارت ختم ہوگئی۔ اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کی قوت کا مخزن ان کا اعلیٰ کردار تھا۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

جزیہ دینے سے جو رتبیل نے انکار کیا
پڑگئی وقت کے سلطان کے ماتھے پہ شکن
صاف توہین تھی یہ نخوتِ شاہی جس پر
کردیا کرتی ہے ہرکوچے میں ارزاں گردن

دوراول کے مسلمانوں کی جو تصویر کشی رتبیل نے کی ہے وہ حقیقت کی مکمل ترجمانی ہے اور آج کے مسلمانوں کے لیے سرمۂ بصیرت بھی۔

پھر بھی تم لوگوں سے وہ لوگ کہیں بہتر تھے
گومیسر نہ تھے ان کو ترے ملبوس بدن
ان کی آنکھوں میں تڑپتی تھی وہ برقِ تمکین

تھر تھرا اٹھتے تھے جس سے دل کہسار وچمن
ان کی ہر بات میں بے لاگ محبت کی جھلک
ان کے ہر کام میں بے باک صداقت کی پھبن
وہ کرم بار وفا کیش غیور وخوددار
عہد وپیما کے وہ پابند تھے تم عہد شکن

مولانا دور صدیقی نے یہ نظم جو مشہور شاعر انور اعظمی مرحوم کی تھی، بڑے جذب وشوق کے عالم میں پڑھائی۔ وہ خود عروج اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والی تحریک سے وابستہ تھے۔ ان سے بہتر عروج وادبارِ مسلم کی تفہیم کون کرسکتا تھا۔

اہلِ حدیث علما کا توازن

تدریس کے دوسرے سال ۱۹۷۰ء میں جو اساتذہ مجھے میسر آئے وہ متدین اہل حدیث تھے اور اعتدال وتوازن ان کا نمایاں وصف تھا۔ مولانا عبدالحمید شفیقی نے کتاب النحو اور کتاب الصرف کا درس دیا۔ ماسٹر شفاعت حسین نے انگریزی پڑھائی اور مولانا محمد الیاس سلفی نے عربی ادب کی تعلیم دی۔

مولانا شفیقی اصلاً مدرس تھے اور نظم وضبط کے معاملے میں سخت۔ وہی صدر مدرس بھی تھے۔ اور کھجوریا گاؤں میں رہائش کی وجہ سے ہمارے اتالیق بھی۔ دوران درس کبھی حنفی المسلک مسلمانوں پر تنقید میں نے نہیں سنی، نہ جماعت اسلامی کا کوئی تذکرہ میرے سامنے ہوا۔ ہاں اہل حدیث علما میں مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگریؒ (۱۹۱۰۔۱۹۹۹ء)، مولانا عبدالمبین منظر سمراویؒ مولانا عبدالقیوم رحمانی (۲۹۱۸ء۔۲۰۰۸ء) اور مولانا عبدالعلیم ماہر سمراویؒ کا ذکر جمیل ضرور ہوتا تھا۔

مولانا محمد الیاس سلفی جامعہ سلفیہ بنارس سے فارغ ہو کے یہاں مدرس ہوگئے تھے۔ نوجوانی کا جوش ان کی باتوں سے ابلتا تھا اور دورانِ درس بھی وہ جذباتی معلوم ہوتے تھے۔ محنت سے پڑھاتے تھے اور اعلیٰ درجہ کی لیاقت کے حامل تھے۔ وہ مسلکِ سلف کی گاہے گاہے ترجمانی کرتے تھے۔ برسبیل تذکرہ جماعت اسلامی کا حوالہ آتا اور وہ بھی قدرے ناپسندیدگی کے ساتھ۔ کھل کر کبھی مخالفت انہوں نے میرے سامنے نہیں کی۔

ماسٹر شفاعت حسین شریف النفس اور سنجیدہ مزاج استاد تھے۔ درس وتدریس کے علاوہ انہیں دوسرے موضوعات سے دلچسپی نہ تھی۔ مسلکی گفتگو کبھی ان کے سامنے نہ ہوئی۔

قیامِ اکرہرا کے دور میں مولانا جھنڈانگری کا ایک خطاب ہم نے تلسی پور بازار میں سنا۔جلسہ کا آغاز بعد نمازِ عشاء ہوا۔اطراف کے مواضعات کے مسلمان عوام کا اژدھام تھا۔ پرال زمین پر بچھا کے آگے دریاں پھیلا دی گئی تھیں۔ پیچھے کی صفوں میں دریاں نہ تھیں۔

دورانِ خطاب کسان اپنے ساتھ لائے کھانا بھی کھا لیتے۔اکثر کھانا کھاتے ہی سو جاتے۔رضا کار پانی کے چھینٹے مار کر انھیں بیدار کرتے رہتے۔رات کو بارہ بجے خطیب الاسلام جھنڈانگری کی تقریر کی باری آئی تو رضا کار لوٹے میں پانی لے کے چاروں طرف دوڑ پڑے۔وہ آواز لگاتے جاتے: ''اٹھو! بڑے مولوی صاحب اب تقریر کریں گے۔''

خطیب الاسلام کی تقریر بڑی دل آویز اور موثر ہوتی۔آنکھوں سے نیند عام طور سے غائب ہو جاتی۔وہ مجمع پر سحر طاری کر دیتے۔اس لیے نہیں کہ ادب و بلاغت کا اعلیٰ درجے میں اظہار ہوتا بلکہ اس لیے کہ صحابہ کرام کے منتخب واقعات سناتے اور خود روتے اور سامعین کو بھی رونے پر آمادہ کر لیتے۔وہ اساطیری روایات اور قصہ کہانیوں سے بچتے۔اصلاح معاشرہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔اپنی زندگی میں ان کے متعدد خطابات سننے کا موقع ملا۔میں نے کبھی انھیں دیوبند اور اہل حدیث چشمک پر گفتگو کرتے نہیں سنا۔

اس زمانے میں ابا کو بارہا کہتے سنا کہ خطیب الاسلام جھنڈانگری نہ صرف یہ کہ مسلکی بیانیہ سے پرہیز کرتے تھے بلکہ دوسرے مکاتب فکر کے علماء سے بھی ان کے روابط تھے۔جماعت اسلامی ہند کے اولین امیر مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ (۱۹۱۳ء۔۱۹۹۰ء) سے بھی ان کے مراسم تھے۔اور یہ تو تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مدرسہ سراج العلوم جھنڈانگر کی عمارت نیپال کے شاہی فرمان کی تعمیل میں منہدم کر دی گئی تھی تو مولانا جھنڈانگری نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء) اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ (۱۹۰۱ء۔۱۹۶۲ء) کے تعاون سے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے رابطہ قائم کیا تھا۔ پنڈت جی نے بادشاہ نیپال سے مراسلت کی تھی اور دوسرا فرمان شاہی جاری ہوا تھا اور مدرسہ کی تعمیر جدید ہوئی تھی۔مولانا جھنڈانگری کی شخصیت سے عقیدت و محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں تدریس وتحقیق کا موقع اللہ نے عنایت کیا تو میں نے ان کی خدمات پر ڈاکٹریٹ کے ایک مقالے کی نگرانی کی۔ڈاکٹر محمد افضل کو ۲۰۱۵ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی۔عنوان تھا:

"A Critical Study of Maulana Abdur Rauf Rahmani's Work in Islamic Learning."

اسی دور میں ابا کو بار بار کہتے سنا کہ علمائے اہل حدیث نے جومشن سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک سے متاثر ہوکے شروع کیا تھا اسی کا تکملہ ہے جماعت اسلامی کا قیام۔ یہ تو اہل حدیث علماء کے نصب العین کی صدائے بازگشت ہی تھی جو سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳۔۱۹۷۹ء) نے لگائی تھی۔ یہ بدعت کے مقابلے میں سنت کا احیا، رسوم وروایات کی جگہ اسلام کی بے آمیز تعلیمات کی اشاعت دونوں تحریکوں کا نصب العین ہے پھر یہ باہم دوری اور مخالفت کیوں ہے؟

نظام طہارت کا فلسفہ

مرحوم محمد ادریس خان کی ڈیوڑھی کے سامنے سڑک پار کر کے ایک ہندو لوہار کا گھر تھا۔ وہ ان کی بیٹھک میں بے تکلفی سے آتا جاتا تھا۔ ہم لوگوں سے بھی اس کی رسم وراہ تھی۔ وہ اکثر ریاح خارج ہونے پر تجدید وضو کرنے کی حکمت کو چیلنج کرتا۔ انداز کچھ استہزا کا ہوتا: تم لوگ ریاح خارج ہونے کے بعد اصل مقام کو دھوتے نہیں، ہاتھ پاؤں اور چہرے کو دھوتے ہو، کیوں؟ اس میں کیا حکمت ہے؟

ادریس خان مرحوم اسے ڈانٹ دیتے: ''تمھیں کیوں پریشانی ہے؟ مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی نہ وہ سوال کرتے ہیں۔ پہلے تم نماز پڑھنے لگو اور مسلمان ہو جاؤ۔ پھر سوال کرنا۔'' ہندو لوہار قہقہہ لگا کے خاموش ہو جاتا۔

بعد میں میرے مطالعہ میں آیا۔ اسی طرح کا سوال نجاست اور طہارت کی حکمتوں سے متعلق کسی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے کیا تھا۔ انھوں نے ماہنامہ ترجمان القرآن محرم۔صفر ۱۳۶۳ھ/جنوری۔فروری ۱۹۴۴ء کے شمارہ میں بڑے بلیغ انداز میں اس کا جواب دیا تھا۔ بعد میں ان کی تصنیف رسائل ومسائل حصہ اول میں یہ جواب شامل کر لیا گیا۔

مولانا مودودی نے اسلام کے نظام طہارت کی عقلی توجیہ پیش کی۔ کسی جزئیہ پر گفتگو کرنے کی جگہ انھوں نے طہارت ونظافت کے اصول وضوابط کی تشریح کی۔ انہوں نے لکھا کہ کسی بھی معقول ومتوازن نظام میں کچھ چیزیں لازماً ایسی مقرر کرنی پڑیں گی جن کے پیش آنے پر ایک طہارت کو ختم شدہ فرض کرنا اور دوسری طہارت کو ضروری قرار دینا ہوگا جسے ہم تجدید کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی متعین کرنا ہوگا کہ ایک طہارت کی مدت قیام کن

حدود تک رہے گی اور کن حدود پر ختم ہو جائے گی۔اس مقصد کے لیے جو حدیں بھی تجویز کی جائیں گی ان میں ناپا کی ظاہر اور محسوس نہیں فرضی اور حکمی ہی ہوگی اور لامحالہ بعض حوادث ہی کو حد بندی کے لیے نشان مقرر کرنا ہوگا۔خروجِ ریاح کو ناقضِ وضو تسلیم کرنا اور نماز کے لیے وضو کی تجدید کرنا اسی قبیل سے ہے۔

مولانا مودودیؒ نے کسی بھی نظام طہارت کی معقولیت اور افادیت کے لیے پانچ شرطوں کو ضروری قرار دیا:

۱۔وہ ایسا نظام ہو جس کے ذریعہ لوگوں کو بار بار پاک اور صاف ہوتے رہنے پر آمادہ کیا جا سکے اور ان میں نظافت کی اس قدر بیداری پیدا کر دی جائے کہ وہ نجاست و کثافت سے از خود دور رہنے لگیں۔

۲۔خدا کے سامنے حاضر و جواب دہ ہونے کی امتیازی حیثیت ذہن میں بیٹھ جائے اور حضوریِ خدا کی ممتاز و منفرد اہمیت قلب و روح میں جاگزیں ہو جائے۔

۳۔لوگوں کو اپنے نفس اور اس کے انجام کی طرف توجہ رکھنے کی عادت پڑ جائے تا کہ وہ پاکی و ناپاکی سے بے خبر نہ رہیں۔

۴۔انسانوں کو افراط و تفریط سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ طہارت کے ضوابط متعین کر دیے جائیں جن کی پابندی عالم و جاہل مرد و عورت سب پر لازم ہو۔

۵۔طہارت میں توازن اور اعتدال ہر حال میں ملحوظ خاطر رہے۔اتنی سختی نہ ہو کہ زندگی اجیرن ہو کے رہ جائے۔نہ اتنی نرمی ہو کہ پاکیزگی کا تصور ہی ختم ہو جائے۔

مولانا مودودی نے لکھا کہ ان شرائط کی روشنی میں شریعت کے نظام طہارت کا جائزہ لیا جائے تو اس کا فلسفہ، اس کی معنویت اور اس کی معقولیت الم نشرح ہو جائے گی۔یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ اسلامی طہارت کا نظام سارے مذاہب سے بہتر ہے اور جامع بھی۔نظام طہارت کے ایک ایک جزئیہ کو الگ الگ لے کر علت و معلول اور سبب و مسبب کا ربط تلاش کرنا معقول طریقہ نہیں ہے۔

ستاروں پر کمند

درجہ ہفتم کا سالانہ امتحان ہوا۔طلبہ نے دل و جان سے تیاری کی۔ہم جماعت ساتھیوں میں اکرہرا کے محمد یار جو ذہن و فطین ہونے کے علاوہ صالح اور سعادت مند بھی تھے، ابتدائی درجات میں اول پوزیشن کے واحد دعوے دار وہی ہوتے تھے، مگر اس بار فضل الٰہی میرے شامل حال رہا۔ہفتم میں اول پوزیشن کا مستحق مجھے قرار دیا گیا۔تمام نتائج سنانے کے بعد پورے مدرسہ میں بھی اول پوزیشن کا حق دار میں ہی ٹھہرا۔

نتائج کا اعلان تمام طلبہ اوران کے سرپرستوں کی موجودگی میں جلسۂ عام کی شکل میں ہوا۔ مجھے اپنے بستر اور صندوق کے ساتھ واپس آنا تھا کیوں کہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں داخلہ کے لیے ابا نے فارم طلب کرلیا تھا۔ اب ہمارا اگلا تعلیمی پڑاؤ وہی تھا۔ ابا نے گاؤں میں کسی سے سائیکل مستعار لے کے باقاعدہ مشق کیا تھا۔ دوروز سائیکل چلا کے تربیت حاصل کرلی تھی۔ نتائج کے اعلان کے وقت وہ مدرسہ میں موجود تھے۔

ہفتم میں اول پوزیشن کے صلے میں ایک فاؤنٹین پین مجھے دیا گیا، جب کہ پورے مدرسہ میں اول پوزیشن کا انعام ایک قیمتی بڑی ڈائری کی شکل میں ملا۔ دل چسپ بات ہے کہ ماسٹر شفاعت حسین انعام کے سامانوں کی خریداری کے لیے بڑھنی بازار گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے اور ریلوے اسٹیشن کے قریب پنّا لال کی دکان سے خریداری کرتے ہوئے انھوں نے میری پسند بھی پوچھی۔ میری سادہ لوحی کہ میں نتائج کو بھانپ تک نہ سکا۔ نتیجہ کا اعلان ہوا تو ابا زار وقطار رونے لگے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے کہ اپنے بچوں کے متعلق ان کے دیرینہ خواب کی تکمیل کی راہ ہموار ہورہی تھی۔

واپسی میں ابا نے سائیکل کے کیریئر پر صندوق رکھا اور اس کے اوپر بستر رکھ کے مضبوطی سے باندھ دیا اور آگے مجھے بٹھایا۔ بڑی مسرت اورانبساط کے عالم میں انھوں نے بیس پچیس کلومیٹر کی مسافت طے کی۔ ابا کی زندگی کا نصب العین جس قدر اعلیٰ اور عظیم الشان تھا اس کے تناسب سے یہ ریاضت ان کے معمولات کا حصہ تھی، مگر بیٹے کی نگاہ میں یہ ستاروں پر کمندیں ڈالنا تھا۔ انہوں نے اپنی حیات میں جو خواب دیکھے انہیں شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے دن رات ایک کردیا کسی ستائش اور صلہ کی پروا کیے بغیر۔ ستائش کے وہ طلب گار نہ تھے اور صلہ تو اس دنیائے فانی میں کوئی انھیں دے بھی نہیں سکتا۔ انھوں نے اپنے رب سے ایک پیمان کیا اور اسی کی لاج رکھنے کے لیے زندگی بھر جہاد کرتے رہے۔ ابا کی باقاعدہ تعلیم درجہ دوم سے زیادہ نہ تھی مگر تبلیغ دین اور احیائے اسلام کے ہدف نے انہیں خطیب بھی بنادیا اور متکلم بھی۔ کیا ہوا اگر انہیں ناموری اور منصب نہ مل سکا۔ اپنے رب کو راضی کرنے کی انتھک محنت وہ کرتے رہے اور ایک عام کارکن کی طرح تحریک اسلامی سے عہد وفا استوار رکھا اور یہی کام یابی کی شاہ کلید ہے۔

مدرسہ اسلامیہ اکرہرا میں اس دوسالہ تعلیم وتربیت نے میری زندگی کی اٹھان کا نہج متعین کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کے متعدد اسباب ہیں:

۱۔ بچپن میں گھر سے باہر کی اقامتی زندگی کا یہ اولین تجربہ تھا۔ اس سے پہلے عام طور پر تعطیل منانے کے

لیےجن جگہوں کا انتخاب ہوتا تھا وہاں میرے لیے ناز ونعم کے پیشگی ضمانت کے لیےقریبی رشتہ دار موجود ہوتے تھے۔ بڑی بہن کی سسرال، ہماری نانیہال یا پھوپھی کا گاؤں یہی ہماری منزل ہوتی تھی۔ان رشتوں میں ماں کی ممتا تو سایہ فگن نہ ہوتی،مگران کی محبتوں کے صدقے میں ہرآ رائش میسر ہوتی تھی۔ مدرسہ اسلامیہ کی اقامتی زندگی نے نفس کے اندر اعتماراورخوداعتمادی کو مستحکم کیا۔

۲۔گھر سے باہر ہم جماعت اور ہم عصر طلبہ سے تعامل کا بھی یہ اولین موقع تھا۔کسر وانکسار سے معاشرت خوش گوار ہوجاتی ہے۔دوسروں کا پاس ولحاظ کرنا اپنی تکریم کو یقینی بنانا ہے۔ یہ راز مجھ پر منکشف ہوا۔ یہاں کی اقامتی زندگی میں نامناسب اور ناخوش گوار تجربات سے بھی پالا پڑا۔ مدرسہ کے شمال میں تالاب سے آگے کی مختصر بستی میں رہنے والے صاحب ثروت صلاح الدین نے مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی۔میرے صبر اور تجاہل کے رویہ نے چنگاری سرد کردی،مگر ہمارے گاؤں ہی کے ایک طالب علم شکیل احمد خان سے، جو مجھ سے جونیر تھے مگر طاقت اور وجاہت میں برتر تھے،صلاح الدین نے معرکہ آرائی کی۔تالاب کے سامنے دونوں میں کشتی ہوئی۔عبدالرشید اور راقم تماشا بین تھے مگر شکیل کے پشت پناہ بھی تھے تاہم اس کی نوبت نہ آئی۔صلاح الدین چت ہوگئے اور لاتوں گھونسوں سے ان کی تواضع بھی ہوئی۔

۳۔گاؤں کے مکتب میں اول پوزیشن کے لیے ہم جماعت شفیق احمد خان سے مقابلہ آرائی آسان تھی۔ یہاں اکرہرا میں میدانِ مسابقت وسیع تر ہوگیا۔مختلف علاقوں کے طلبہ کے درمیان مسابقت قدرے مشکل تھی۔لہوولعب سے بے نیاز زندگی کی دوڑ میں اپنی جگہ بنانے کا ہنر یہیں سے سیکھا۔

دوسالہ اقامت کے اس تجربے نے آگے کی مشکلات آسان کردیں، میرے لیے بھی اور والدین کے لیے بھی۔اماں کو یقین آ گیا کہ ان کا لاڈلا اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا سلیقہ سیکھ گیا ہے اور مقابلہ آرائی میں دوسروں سے آگے نکلنے کے داؤں پیچ سے بھی وہ آگاہ ہوگیا ہے۔ان کی نفسی کلفت اب طمانیت میں بدل گئی اور قلب ودماغ پر حاوی مجبوری کی شدت بھی کم ہوگئی۔

●●

معاشرے کی تعمیر میں صحافت کا کردار

انتخاب عالم شمسی

یہاں نفس موضوع کے متعلق ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ صحافت کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟ چوں کہ صحافت ایک فن ہے اور آرٹ ہے اور فن یا آرٹ کے بارے میں دو نقطۂ نظر شروع سے پائے جاتے ہیں:

۱۔آرٹ فاردی آرٹ سیک

۲۔آرٹ فاردی سوسائٹی

آرٹ فاردی آرٹ سیک یعنی فن برائے فن۔یعنی فن کو فن کے لیے ہونا چاہیے۔اسے کسی اور دیگر مقصد کے لیے قربان نہیں کیا جاسکتا۔

اصل میں لا پالا ایک فرانسیسی سلوگن تھا جسے فرانسیسی فلاسفر تھیوفیل گوچے نے دیا تھا۔اس نے اس بات کی وکالت کی کہ فن کو سماجی، سیاسی اور اخلاقی قیود سے آزاد ہونا چاہیے اور جو فن ان حدود و قیود سے آزاد ہے وہ ایک مکمل فن ہے۔لیکن اس نظریہ پر جا بجا تنقیدیں ہوئیں۔خاص طور پر کمیونزم کے حامیوں نے اس پر تنقید کی اور بتایا کہ جو فن اخلاقی حدود و قیود سے آزاد ہوگا، وہ بے مقصد ہوگا۔لہٰذا اس کے مقابلے میں آرٹ فاردی سوسائٹی کا نظریہ دیا گیا۔یعنی فن کا مقصد سماج کی خدمت اور اس کی تعمیر ہو۔

اب چوں کہ صحافت یعنی میڈیا بھی ایک فن ہے۔اس لیے اس کے بارے میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔صحافت کا لفظ دراصل صحف سے ماخوذ ہے، جس کے معنی مقدس اوراق کے ہیں اور یہ لفظ آسمانی کتابوں کے لیے قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔قرآن مجید میں صحف مطہرہ کا لفظ جا بجا استعمال ہوا ہے۔اس لفظ سے اس کے بامقصد ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے، ساتھ ہی اس سے اس پیشہ کا تقدس بھی ظاہر ہوتا ہے۔یعنی جس طرح تاریکی میں بھٹکتے انسانوں کے لیے اللہ رب العزت نے آسمانی صحیفے نازل فرمائے تاکہ لوگوں کو سیدھا راستہ ملے اور وہ کامیابی سے ہم کنار ہوں، اسی طرح ایک صحافی کی ذمہ داری

بھی ہے کہ وہ لوگوں کو کو صحیح راستہ کی رہ نمائی کرے اور غلط راستوں سے خبردار کرے۔ اس لحاظ سے اگر ہم لفظ کا اعتبار کریں تو ایک صحافی خلائی مشن کو انجام دینے والا فرد ہوتا ہے۔

زیر نظر موضوع نہایت وسیع ہے۔ گفتگو کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صحافت سے متعلق اسلامی رہ نما اصولوں کی وضاحت کی جائے۔ یہ ایک نہایت اہم موضوع ہے، لیکن اس کے بارے میں پھر کبھی گفتگو ہوگی۔

آج ہم ہندوستان میں صحافت کے بدلتے منظر نامہ اور پھر اس بارے میں تعمیری صحافت کیا ہونی چاہیے؟ اس پر گفتگو کریں گے۔

ہندوستان میں میڈیا کے بدلتے منظر نامے پر تبادلہ خیال سے پہلے میڈیا کے ماڈلز پر نظر ڈالنا ضروری ہے تاکہ صورت حال کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ میڈیا کے بارے میں تین طرح کے ماڈلز سامنے آئے ہیں:

☆ اسٹیٹ کنٹرول ماڈل

☆ پبلک سروس ماڈل

☆ مارکیٹ ڈرائیون ماڈل

اسٹیٹ کنٹرول ماڈل جیسا کہ ہم سب جانتے ہوں گے وہ ماڈل ہوتا ہے جس میں سارا کا سارا میڈیا ریاست کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ کوئی خبر اور کوئی آرٹیکل ریاست کی اجازت کے بغیر شائع نہیں ہو سکتا۔ صحافت پوری طرح حکومت کے زیر اثر ہوتی ہے۔ حکومت صحافت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوتی ہے۔ لیکن صحافت کا بنیادی کام جو حکومت اور حکم راں طبقے کو آئینہ دکھانے کا ہوتا ہے، پوری طرح مفقود ہوتا ہے۔

اس ماڈل کے اپنی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ لیکن دنیا کے زیادہ تر حصوں میں جہاں جمہوری نظام رائج ہے۔ یہ ماڈل اب ترک کیا جا چکا ہے۔ عرب ممالک، جہاں شاہی نظام اب بھی قائم ہے یہی ماڈل ہے جس پر میڈیا کام کرتی ہے۔ البتہ یہ سوال اب وہاں بھی پیدا ہو گیا ہے کہ گلوبلائزیشن، میڈیا ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کے اس دور میں میڈیا کو کس حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے؟

میڈیا کا ایک دوسرا ماڈل پبلک سروس ماڈل ہے۔ یہ وہ ماڈل ہے جس میں میں میڈیا با اختیار ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس پر ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ اس ماڈل میں میڈیا کا رول سیر و تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت بھی ہوتا ہے۔ اس ماڈل کی بہترین مثال بی بی سی اور الجزیرہ چینلز ہیں۔ ان چینلز میں آپ

دیکھیں گے کہ اشتہارات کا تناسب نہ کے برابر ہوتا ہے۔ اسے ایک بہتر ماڈل شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کو قائم کرنے میں کئی طرح کے چیلنجز کا سامنا درپیش ہوتا ہے۔

تیسرا ماڈل جو آج دنیا کے زیادہ تر حصوں میں رائج ہے، وہ مارکیٹ ڈرائیون ماڈل ہے۔ ہمارے ملک نے بھی آج اسی کو پوری طریقہ سے اپنا لیا ہے۔ اس ماڈل میں میڈیا مارکیٹ کے کنٹرول میں ہوتا ہے اور میڈیا کا مقصد منافع کمانا ہوتا ہے۔

میڈیا کو اپنی بقا کے لیے ذرائع اور وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے منافع کمانا کوئی غلط چیز نہیں ہے۔ کمرشیلائیزیشن کی ایک حد تک اجازت دی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر صحافت کے اعلیٰ مقاصد کو پس پشت ڈال دیا جائے اور بنیادی مقصد ہی پیسہ کمانا ہو جائے، تو اس کے جو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، وہ ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔

مارکیٹ ڈرائیون ماڈل میں اگرچہ میڈیا کو آزاد خیال کیا جاتا ہے اور حکومت کی طرف سے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ میڈیا ہاؤسز اپنے اپنے مواد کو خود ڈیزائن کرتے ہیں اور اس پر کسی طرح کی سنسر شپ نہیں ہوتی، لیکن اس کے باوجود اسے کئی طرح کے چیلنجز کا سامنا ہوتا ہے، جن میں دو خاص ہیں:

پہلا چیلنج اسے مارکیٹ کی طرف سے ہوتا ہے، یعنی میڈیا پوری طرح مارکیٹ کنٹرول میں ہوتا ہے۔ انڈسٹریز میڈیا کا ٹنٹ کو ڈیسائیڈ کرنا شروع کر دیتی ہیں اور سیاسی اور سماجی اور تعلیمی اور اخلاقی سطح پر ذرائع ابلاغ کا جو مقصد ہوتا ہے، وہ پس پشت چلا جاتا ہے۔ آج عالمی ذرائع ابلاغ کا کم و بیش یہی حال ہے۔ اب چاہے وہ اخبارات ہوں یا ٹیلی ویژن ہو، یا پھر انٹرنیٹ سب پر مارکیٹ کا غلبہ ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ایک ایسا شخص جس نے اعلیٰ مقاصد کے لیے صحافت کے پیشے کو اپنایا ہو، وہ پوری طرح کم زور اور بے بس محسوس کرتا ہے اور چاہے نہ چاہے اسے بھی وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو کہ میڈیا آرگنائزیشنز چاہتے ہیں اور جس کی پالیسیز مارکیٹ ڈیسائیڈ کرتی ہے۔

خبریں مرچ مصالحے سے بھرپور ہوتی ہیں اور حقیقی ایشوز سے دور دیگر ایشوز پر بات چیت ہو رہی ہوتی ہے۔ میڈیا کمرشیلائیزیشن ایک اہم عنوان ہے، جس پر بات کرنے کے لیے اچھا خاصا وقت درکار ہے ویسے ہم سب اس سے کسی حد تک واقف ہیں۔

لیکن اس ماڈل میں صحافت کو دوسرا بڑا چیلنج ہے، وہ بے حد خطرناک ہے اور اس کا اثر ادھر چند سالوں

میں خود ہمارے ملک میں اضافہ ہو رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ صحافی یا میڈیا ہاؤسز سسٹم کی زبان بولنا شروع کر دیں۔ یعنی یہ کہ صحافت اگر چہ بظاہر آزاد ہو لیکن حکومت یا حکومتی نظام اس پر پوری طرح حاوی اور اندر ہی اندر پریس کی آزادی دم توڑ چکی ہو۔

مارکیٹ ڈرائیون ماڈل کے انھیں چیلنجز کو دیکھتے ہوئے ایک پریس تھیوری یہ بھی ہے کہ میڈیا کمزوروں کو طاقت عطا نہیں کرتا بلکہ پاورفل کو اور پاورفل بناتا ہے۔ اس کے ذریعے سسٹم کو نہ تو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے درست کیا جا سکتا ہے، بلکہ جن کے ہاتھوں میں ذرائع اور وسائل ہیں۔ اقتدار ہے میڈیا ان کے اقتدار میں اور اضافے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

بظاہر یہ تھیوری ہم سب کو عجیب لگ رہی ہو گی، کیوں کہ ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ میڈیا بے حد پاورفل ہے اور اس کے ذریعے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کی حدود ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ میڈیا کمزوروں کے بجائے طاقتوروں کا زیادہ مؤثر ہتھیار ہے۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی تردید میں آپ کی مثال پیش کریں گے۔ اس کی تردید میں ایک بڑی مثال خود ہمارے ملک میں آزادی سے پہلے کی صحافت کا رول ہے۔ جنگ آزادی میں صحافت کا کردار مثالی رہا ہے اور اس نے حصول آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اس وقت کی صحافت اور آج کی صحافت میں بڑا فرق ہے۔

اگر ہم ایک بہتر صحافت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں اور اس کے ذریعے ایک صالح معاشرہ کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں موجودہ میڈیا سسٹم کو الوداع کہنا ہوگا اور قلم کے ذریعے ایک طرح کا جہاد کرنا ہوگا اور ہر طرح کے دباؤ کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ موجودہ میڈیا کے نظام کا حصہ بن کر شاید ہم یہ سب کچھ نہیں کر پائیں گے۔

گلوبلائزیشن کے دور میں صحافت کی طاقت کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج ہم اپنے موبائل فون کے ذریعے ساری دنیا سے جڑے ہوئے ہیں۔ پوری دنیا میں ہو رہے ہر ہر پل اور ہر ہر لمحے کی خبریں ہمیں مل رہی ہیں .. خبروں کے علاوہ ان خبروں کا تجزیہ بھی ہمارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ ٹکنالوجی میں آئی ترقی کی وجہ سے بہت کچھ ہو رہا ہے۔ خبر اور اس کے کے تجزیہ کے علاوہ مختلف افکار اور نظریات بھی ہمارے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس میں زیادہ تر مواد وہ ہوتا ہے جو تعمیری نہ ہو کر تخریبی اور مذہب مخالف ہوتا ہے۔ ایسے میں ایک صالح میڈیا کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے لیکن یہ راہ آسان نہیں ہے۔

اگر ہم ایک متبادل میڈیا کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں اور اسے قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے

نیچر کو سمجھنا ہوگا اور ایک مشنری جذبہ کے ساتھ اس میں داخل ہونا ہوگا۔ ایسا کرنے کی صورت میں آج بھی ہمیں انہی چیلنجز کا سامنا کرنا ہوگا جس طرح کے چیلنجز صحافیوں کو آزادی سے پہلے درپیش تھے، بلکہ ماہرین کا یہ ماننا ہے کہ موجودہ وقت کے چیلنجز اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔

آج ہمارے ملک میں صحافت کو سب سے بڑا چیلنج سسٹم کا ہے چاہے۔ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا یا ہاؤسز بھی سسٹم کی زبان بولنے لگے ہیں۔ وہ اس بارے میں سارے حدود و قیود پار کر گئے ہیں۔

درجنوں ٹیلی ویژن چینلز میں شاید صرف ایک چینل کسی حد تک اس سے الگ ہے اور کچھ سوشل میڈیا چینلز ہیں جو تعمیری رول ادا کر رہے ہیں۔ لیکن وہ بھی کسی حد تک ہی ایسا کر پا رہے ہیں۔ ان پر بھی دباؤ بہت زیادہ ہے۔ ملک کی سیاسی صورتِ حال میں تبدیلی کے سبب اب تو صورت حال اور بھی سنگین ہوگئی ہے۔ چونکہ میں نے صحافت میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے اس لیے میں اس بات سے واقف ہوں کہ کس طرح خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے لکھے لکھائے اسکرپٹ میڈیا ہاؤسز کو دے دیا جاتا ہے جو کہ حکمراں جماعت کی حمایت میں ہوتا ہے اور یہ سب کچھ ملکی مفاد کے نام پر ہوتا ہے۔ اسے نہ ماننے کی صورت میں سنگین صورتِ حال کی دھمکی بھی دی جاتی ہے۔

جہاں تک سسٹم کی زبان بولنے کی بات ہے تو ایسا ڈر کی وجہ سے بھی ہو رہا ہے اور لالچ کی وجہ سے بھی۔ بلکہ زیادہ تر چینلز لالچ کی وجہ سے ہی ایسا کر رہے ہیں لیکن اب تو کچھ متبادل میڈیا ہاؤسز پر چھاپے مارے جانے کے واقعات بھی سامنے آرہے ہیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ سب پروپیگنڈا کا حصہ ہے اور ایک خاص طبقہ اپنے غلبے کے لیے ایسا کرنا چاہتا ہے۔ جہاں تک پروپیگنڈے کی بات ہے تو ہماری نفسیات پروپیگنڈے کے بارے میں کچھ عجیب سی ہوتی ہے۔ ہم عام طور پر پروپیگنڈے کے اثر کو تسلیم کرتے ہیں لیکن خود کو اس سے محفوظ سمجھتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پروپگنڈا سماج پر اثر انداز ہوگا، ہم پر نہیں۔ لیکن ہم بھی اسی سماج کا حصہ ہیں۔ جب ہمارا گردوپیش اور خود ہمارے گھر والے اس سے متاثر ہو جائیں گے تو ہم کیسے اس سے محفوظ رہیں گے؟ ایسی صورتِ حال میں ایک متبادل میڈیا کی ضرورت شدید تر ہوگئی ہے، جس کو ہمیں قائم کرنا ہوگا اور اس کے لیے قربانیاں دینی ہوں گی۔

مقاماتِ آہ وفغاں اور بھی ہیں

عبداللہ زکریا

انسان حیوانِ ناطق ہے اور اس کی یہی صلاحیت اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ نطق اور یہ صلاحیتِ گویائی دنیا میں آنے والے سب سے پہلے انسان میں potential کی شکل میں موجود تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کو ترقی دینے میں ہزاروں سال لگ گئے۔ مورخین اور ماہرین بشریات (Anthropologist) آج بھی اس بات کا تعین نہیں کر سکے ہیں کہ انسان نے کمیونیکیٹ کرنا کب شروع کیا۔ یہ دورانیہ پچاس ہزار سال سے دو ملین سال، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ پھر یہ امر بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ انسان نے کب زبان کا استعمال شروع کیا؟ اس بابت بھی بہت اختلافات ہیں اور یہ بحث اتنی لا یعنی اور مہمل ہوگئی تھی کہ ۱۸۸۶ء میں لنگوسٹک سوسائٹی آف پیرس نے اس موضوع پر مزید تحقیق پر پابندی لگا دی۔ آج بھی ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے بولنا کب شروع کیا، کن حالات میں کا اور الفاظ کی origin کیا ہے؟ مذہبی صحیفوں سے ضرور رہ نمائی ملتی ہے۔ Gospel of John ورس نمبر ا:ا میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں:

''In the beginning was the word and the word was with God''

قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کے تعلق سے اللہ فرماتے ہیں کہ ''**و علم آدم الاسماء کلھا**''۔ اسی طرح آپؐ پر جو سب سے پہلی وحی اتری، اس میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ''**وعلم الانسان ما لم یعلم**۔'' سو یہ علم الاسماء سب سے پہلے انسان کے وجود کا ایک حصہ تھا اور ماہرین بشریات وارضیات کے مطابق اس کو دریافت کرنے میں نسلِ انسانی کو ہزاروں سال لگ گئے۔ ہاں مذہبی نقطۂ نظر سے ہم ضرور اس کو رد کر سکتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کی توبہ کے الفاظ ہمیں معلوم ہیں: ''**فتلقی آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ** ''۔ لیکن اگر نسلِ انسانی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اولادِ آدم کو اپنی زبان دریافت کرنے کے لیے ہزاروں صدیوں کا سفر کرنا پڑا۔ اس ساری تمہید سے بتانا صرف یہ مقصود تھا کہ کمیونی

کیشن بھی انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔یہ الگ بات ہے کہ کمیونی کیشن کے طریقے ہر دور میں تبدیل ہوتے رہے ہیں اور ان میں مزید ترقی ہوتی رہی ہے۔تصویروں،آوازوں اور الفاظ کا یہ سفر آج اس مقام پر پہونچ چکا ہے کہ معلومات کی ایک یلغار ہے۔ہر دور میں کمیونی کیشن کے اپنے طریقے اور چیلنج رہے ہیں۔غاروں میں تصویریں بنانے والے انسان سے لیکر درختوں کے پتوں اور ہڈیوں پر لکھنے والے انسان نے اپنے طریقے سے اپنے دور کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب نے البتہ کمیونی کیشن میں تاریخ انسانی کا سب سے بڑا انقلاب برپا کیا اور پرنٹنگ پریس کی ایجاد نے اس بات کو ممکن بنادیا کہ ایک ہی ساتھ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں کتابیں چھاپی،بھیجی اور محفوظ رکھی جا سکیں۔یورپ میں renaissance کی سب سے بڑی وجہ اگر تھی تو یہ نیا انقلاب تھا۔صدیوں پر محیط علم،جو مسلمان دانشوروں،فلسفیوں اور سائنس دانوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا،اب اقوامِ یورپ کے لیے ان سے استفادہ کرنا بے حد آسان ہو گیا۔لیکن ابھی کمیونی کیشن میں سب سے بڑا انقلاب آنا باقی تھا جو انٹرنیٹ کی شکل میں آیا اور جس نے پوری دنیا ہی بدل دی۔انفارمیشن ٹکنالوجی میں آئے ہوئے اس انقلاب نے پوری دنیا کو ایک گلوبل ولیج میں تبدیل کر دیا ہے اور اب زمامِ اقتدار اسی کے ہاتھوں میں رہے گی جس کے قبضہ میں یہ ٹکنالوجی ہوگی۔اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ نے مل کر جہاں اس بات کو ممکن بنا دیا کہ دنیا میں کسی جگہ رہتے ہوئے آپ پوری دنیا سے جڑے رہ سکتے ہیں،وہیں اس نے اس بات کو بھی ممکن بنا دیا کہ انفارمیشن کے ساتھ مس انفارمیشن بھی پھیلائی جا سکے۔اس کا سب سے بڑا مظاہرہ ہم نے سابق امریکی صدر ٹرمپ کے پچھلے الیکشن میں دیکھا جہاں جھوٹ اور فیک نیوز کی شکل میں چلائی گئی ایک مہم نے امریکی عوام کو اس قدر متاثر کر دیا کہ ہلری کلنٹن جیتا ہوا الیکشن ہار گئیں۔ہندوستان اور مسلمانوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس انقلاب نے انھیں اس دوراہے پر لا کھڑا ہے کہ ان کی جان و مال اور عزت آبرو بھی خطرے میں ہے اور ان کا مذہبی تشخص بھی داؤ پر لگ گیا ہے۔پرنٹ میڈیا اور نیوز چینلوں کے ساتھ،جن کا ایک بڑا حصہ ۲۰۱۴ء کے الیکشن کے بعد سے ہی برسرِ اقتدار پارٹی کے ساتھ کھڑا ہے،ایک اور نیا فتنہ بھی ابھر کر سامنے آیا،جسے وہاٹسپ یونیورسٹی کہتے ہیں۔دنیا میں کہیں بھی میڈیا غیر متعصب نہیں ہوتا ہے۔امریکا جیسا ملک جو شخصی آزادی اور حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا چیمپین ہے،وہاں بھی ہم نے Global war on terror میں دیکھا ہے کہ اس نے کس طریقے سے نہ صرف یہ کہ اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ دیا بلکہ جرنلزم کے سارے اصولوں کو بالائے طاق رکھ جھوٹی رپورٹنگ بھی کی۔

embedded journalism کی اصطلاح عراق کی جنگ کی دین ہے جہاں پہلی بار دنیا نے دیکھا کہ جرنلسٹ نہ صرف فوج کے ساتھ چل رہے ہیں بلکہ ان کی ساری رپورٹنگ بھی فوجی بریفنگ پر منحصر ہے۔ یہ دنیا کی پہلی جنگ ہے جو لائیو (live) آپ کے ڈرائنگ میں دکھائی گئی۔ بی بی سی جسے ہم سچائی کا پیکر مانتے ہیں وہ بھی ٹونی بلیر کے جھوٹوں پر چپی سادھے رہا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کچھ ایسا نہیں ہو رہا ہے جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی، ہاں اس پیمانے پر اور اس sustained طریقہ سے شاید صرف نازی جرمنی میں ہوا ہے۔

نائن الیون کے بعد ویسے ہی دنیا میں اسلاموفوبیا بڑھ رہا تھا تو بھارت اس سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ انگلش میڈیا کا زیادہ حصہ ہمیشہ غیر جانب دار رہا ہے کیوں کہ وہاں کام کرنے والے زیادہ لوگ اشتراکیت سے متاثر اور لبرل خیالات کے رہے ہیں لیکن vernacular میڈیا ہمیشہ سے مسلمانوں کے تئیں شک وشبہات کو فروغ دیتا ہے رہا ہے جس میں ہندی کے اخبارات سرِ فہرست رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن پہلے بہت سالوں تک سرکاری رہا پھر کچھ پرائیویٹ نیوز چینل آئے لیکن وہاں بھی دبدبہ انگریزی صحافیوں کا رہا جو بنیادی طور پر لبرل خیالات کی نمائندگی کرتے تھے۔ سن دو ہزار کے بعد سے نیوز چینل مشروم کی طرح اگنے لگے اور پہلی بار غیر سرکاری ہندی نیوز چینلوں کی ایک باڑھ سی آ گئی۔ ان کی اپنے ٹارگٹ آڈینس تھے اور ان کا اپنا ایجنڈا تھا۔ یہ ایک طرف تو بھوت پریت کی کہانیاں بھی دکھاتے تھے تو دوسری طرف طالبان کے تعلق سے بھی روزانہ کچھ نہ کچھ پروسا جاتا تھا۔ جہاد اور مسلمانوں کے تعلق سے ایک رائے بننی شروع ہوگئی تھی۔

۲۰۱۴ء کے بعد تصویر بالکل بدل گئی۔ اب انگلش میڈیا کے وہ صحافی بھی برسرِ اقتدار پارٹی کی ہاں میں ہاں ملانے لگے جو پہلے لبرل خیالات کے لیے جانے جاتے تھے۔ اور یہ منظر نامہ صرف پرنٹ تک محدود نہیں تھا، ٹائمس ناؤ کی شکل میں اب ایک چینل نے بھی ان مسائل کو بہت جارحانہ طریقے سے اٹھانا شروع کر دیا جو بالواسطہ یا بلا واسطہ مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ٹائمس گروپ ویسے بھی بہت مضبوط ہے اور اسکی reach بھی بہت ہے تو اس جارحانہ لیکن coloured رپورٹنگ نے ایک کثیر تعداد کے ذہنوں میں شک کے بیج بونے شروع کر دیے۔ ٹیلوی ویژن کی پہنچ چوں کہ بہت زیادہ ہوتی ہے اور تصویریں زیادہ دیرپا اثر چھوڑتی ہیں، اس لیے یہ نقصان اپنی نوعیت کے حساب سے بہت دوررس رہا۔ Times Naow چھوڑ کر ارنب گوسوامی نے جب ریپبلک شروع کیا تو جو tone اور pitch انھوں نے ٹائمس میں تیار کیا تھا اسے دوآتشہ کر دیا۔

کارواں میگزین نے، جو ان معدودے چند میگزینوں میں سے ایک ہے جو ابھی بھی صحافت اور رجانبدارانہ رپورٹنگ کا معیار قائم ہوئے ہے۔ پچھلے ہفتہ ایک بہت دل چسپ اور آنکھیں کھول دینے والی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ میں پچھلے کچھ سالوں میں این ڈی ٹی وی اور ریپبلک بھارت میں ہونے والی Debates کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ریپبلک بھارت نے ۲۰۱۷ء سے ۲۰۲۰ء تک جو ۱۷۷۹ Debates کی، ان میں صرف ۹۴ ڈبیٹ ایسی ہیں جہاں برسرِ اقتدار پارٹی سے سوال پوچھا گیا ہے یا اس کی کسی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ جب کہ این ڈی ٹی وی کی ۲۰۰۱ء سے ۲۰۲۰ء تک کی ۱۵۸۲ Debates میں ۳۳۴ میں سیاست بحث کا موضوع رہا ہے اور گورنمنٹ سے سوال پوچھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ریپبلک بھارت نے اس عرصے میں ۵۹۵ Debates میں اپوزیشن پر نشانہ سادھا ہے۔ جب کہ این ڈی ٹی وی نے ۶۵ بار اپوزیشن کو کٹمورِ دِ الزام ٹھہرایا ہے۔

پرنٹ اور ٹیلی ویزن میڈیا تو پھر بھی پریس کونسل آف انڈیا کے زیرِ نگرانی چلتے ہیں اور ان کے ذریعہ پیش کیے گئے کسی بھی مواد کی شکایت درج کی جاسکتی ہے لیکن سوشل میڈیا نام کا جو عفریت ہے اس پر کسی کا کنٹرول نہیں ہے اور اس کے ذریعہ کوئی بھی فیک نیوز اور Misinformation پھیلائی جاسکتی ہے۔ اسمارٹ فون اور ۲ جی بی فری ڈیٹا کیا قیامت لاسکتا ہے، وہ ہم نے تبلیغی جماعت اور اس کے ذریعہ پھیلائے گئے کرونا کے پروپیگنڈے میں دیکھ ہی لی کہ کس طرح ایک جماعت اور اس کے ذریعہ ایک پورے طبقے کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ کتنے ہی جعلی ویڈیوز پھیلائے گئے اور پورا ماحول تیار کیا گیا کہ کرونا پھیلانے کا سارا الزام ایک مخصوص کمیونیٹی پر رکھ دیا جائے۔ یہ پروپیگنڈہ اور یہ مس انفارمیشن اتنا موثر تھا کہ ملک کی ایک بڑی تعداد نے مان لیا کہ کرونا تبلیغی جماعت کی وجہ سے ہی پھیلا ہے۔ سوشل میڈیا اور اس پر ہونے والی ٹرولنگ کا اثر کیا ہوسکتا ہے اس کو حال میں گزرے دو واقعات سے اور بہتر طریقے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابھی دیوالی کے موقع پر تنشک نامی برانڈ نے جو Tata conglomerate کا ایک حصہ ہے اپنے ایک ایڈ میں قومی اور مذہبی ہم آہنگی دکھانے کی کوشش کی۔ ایک مسلم خاندان کی ہندو بہو کا بے بی شاور اور ساس بہو کا پیار فلمایا گیا، لیکن اسے لو جہاد سے جوڑ دیا گیا اور اس کی اتنی ٹرولنگ ہوئی کہ ٹاٹا جیسے بڑے اور مضبوط کارپوریٹ گھرانے کو ڈر کر یہ اشتہار ہٹانا پڑا۔ اس سے بھی دل چسپ ایک رپورٹ ابھی نکل آئی ہے۔ جیو نے ٹیلی کام اتھارٹی کو لکھ کر ایک شکایت بھیجی ہے کہ پنجاب، ہریانہ اور یوپی میں لوگوں کو بہکا کر جیو سے اور دوسرے نیٹ ورک میں port

کرانے کی سازش چل رہی ہے۔دراصل ہوا یہ کہ کسان آندولن سے سوشل میڈیا پر جیو کو بائی کاٹ کرنے کی اپیل کی گئی ہے جس کا بہت زبردست اثر دیکھنے کو مل رہا ہے اور جیو کو زمین کھسکتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ تو ہے تصویر کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ کہ اس سے نمٹنے کے لیے ہم نے کیا لائحۂ عمل طے کیا ہے اور ہماری تیاری کیسی ہے؟

سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو کوئی خاص تیاری دکھائی نہیں دے رہی ہے۔جس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو ہم اس خطرے کے scale اور اس کی تباہی سے پوری طرح واقف نہیں ہیں یا ہم سمجھ رہے ہیں کہ یہ ایک وقتی چیز ہے اور یہ بھی گزر جائے گا۔ ہماری تیاری کا یہ عالم ہے کہ ہمارا خود کا نیوز چینل تو چھوڑ دیں ڈھنگ کا ایک انگریزی اخبار تک نہیں ہے۔سید شہاب الدین مرحوم نے 'مسلم انڈیا' کے نام سے ایک بہت اچھی کوشش کی تھی اور فسادات کے تعلق سے اسکا کام بہت شاندار تھا لیکن افسوس کوئی ان کی وراثت کو آگے نہیں بڑھا سکا۔ ملی گیزٹ اور ریڈینس کی پہنچ اتنی زیادہ نہیں اور جس اسکیل پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس کے لیے بالکل ناکافی ہیں۔ ہمارے پاس ٹائمس آف انڈیا، ہندوستان ٹائمس، انڈین ایکسپریس یا ہندو جیسا کوئی بڑا اخبار نہیں ہے۔ ہندی میں اگر کوئی قابلِ ذکر اخبار ہے تو مجھے معلوم نہیں۔ رہ گئے اردو کے اخبارز تو ان کا وژن اتنا بڑا نہیں ہے، دوسرے ان میں زیادہ تر جذباتیت ہی دکھائی دیتی ہے۔انقلاب جو کم سے کم ممبئی کی حد تک سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اخبار ہے، اسے دینک جاگرن گروپ نے خرید لیا ہے۔ ریڈر شپ مسلم ہے اس لیے کھلے طور پر تو زعفرانی ایجنڈا آپ کو نہیں ملے گا لیکن بین السطور بہت کچھ پڑھا جا سکتا ہے۔ کچھ ورنا کولر اخبارات یقیناً اپنے اپنے صوبوں میں یہ جنگ لڑنے کی کوشش کر رہے، لیکن ان کی پہنچ پین انڈیا(pan India) نہیں ہے۔

افسوس کی ہماری لڑائی رویش کمار، برکھا دت، سدھارت وردا راجن، ارندھتی رائے اور راجدیپ رگوہا جیسے لوگ لڑ رہے ہیں یا پھر اسکرول (scroll) جیسی ڈیجیٹل ویب سائٹ۔ نیوز لانڈری نام کا بھی ایک ویب پورٹل ہے جو گودی میڈیا کی قلعی کھولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ رعنا ایوب اور عارفہ خانم شیروانی جیسی بہادر جرنلسٹ بھی ہیں لیکن ان پر مسلم ہونے کا ایسا ٹھپہ لگا ہے کہ ان کی صداقت کو مشکوک بنانے کا ہر مذموم ہتھکنڈا اپنایا جاتا ہے۔ جس طرح ان کی trolling ہوتی ہے اللہ کی پناہ۔ ہمارے پاس نہ تو dedicated IT Cell ہے اور نہ ہی Alt news جیسی ویب سائٹ۔ Twitter نام کی چڑیا سے تو شاید ہماری جماعتیں واقف بھی نہیں ہیں۔ آج کل سارے ایجنڈے Twitter پر طے ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح آلٹ نیوز کے

بارے میں بھی شاید کم ہی لوگ جانتے ہوں گے۔ یہ ایک پورٹل ہے جو فیک ویڈیوز کی جانچ کرتا ہے۔ تبلیغی جماعت والے پروپیگنڈے میں اس نے جو کام کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ ہر جھوٹے ویڈیو کی پول اس نے کھول کر رکھ دی۔ مسئلہ یہ کہ ابھی شروعاتی دور میں ہے اور اس کی پہنچ اتنی زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے ہوتا یہ ہے کہ جب تک یہ لوگ جانچ پڑتال کر کے کسی ویڈیو کو فیک ثابت کریں تب تک وہ پھیل کر ذہنوں کو مسموم کر چکا ہوتا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر بھی وا ہو جائے گی کہ مذکورہ بالا کوئی ویب سائٹ یا پورٹل ایسا نہیں ہے جو کوئی مسلمان یا مسلمان جماعت چلا رہی ہے۔

ہماری قیادت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ کہ اس نے جذباتی نعروں سے قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔ مسئلہ فلسطین اور روہنگیا کے نام پر تو ہم ہزاروں کی بھیڑ جمع کر لیتے ہیں لیکن اپنی گلی محلوں کے مسائل سے ہمارا بہت زیادہ کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مسلمانوں پر دنیا میں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہو اس کے خلاف آواز بلند کرنا ہمارا دینی اور ملی فریضہ ہے لیکن آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ ۲۰۱۴ء سے ماب لنچنگ کو جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے خلاف آپ نے کوئی outrage دیکھا۔ یقیناً کچھ پمفلٹ بانٹے گئے اور کچھ مذمتی قراردادیں پاس ہوئیں لیکن جس اسکیل پر ہماری قیادت مسلمانوں کو فلسطین اور روہنگیا کے مسئلہ پر میدان میں لائی اس کا تو عشرِ عشیر بھی ماب لنچنگ میں نہیں دکھا۔ ایک ڈاکومینٹری کے سلسلے میں، میں سالِ گزشتہ جھارکھنڈ گیا تھا، جو ہریانہ کے ساتھ لنچنگ کا سب سے بڑا گڑھ ہے، وہاں جو مسلمان اس کا شکار ہوئے ہیں وہ سب کے سب انتہائی پس ماندہ اور غریب ہیں اور cattle trading ان کا آبائی پیشہ ہے۔ کیا ان کے لیے آواز اٹھانا فیشن ایبل نہیں ہے؟ یا ان کے حق میں آواز اٹھانے سے میڈیا کوریج نہیں ملے گی؟ ایک دل دہلانے والا واقعہ آپ سے شیر کرتا ہوں۔ ایک کیس ایسا ہوا تھا جس میں دو لاشیں ایک پیڑ سے لٹکا دی گئی تھیں، اس میں ایک چودہ سال کے بچہ کی لاش بھی تھی۔ اس کے والد نے ہمیں بتایا کہ جب یہ لنچنگ ہو رہی تھی تو وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے چھپ کر دیکھ رہا تھا اور اس کی غربت نے اسے یہ سمجھایا کہ اگر وہ اپنے بیٹے کی مدد کے لیے گیا تو وہ لوگ اسے بھی مار دیں گے اور اس کا پورا خاندان بھوکوں مر جائے گا۔ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے، یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ کیا ہمارا خون اس کے لیے کھولا؟ پورے ہندوستان میں لنچنگ کے جتنے واقعات ہوئے ہیں اور اس کا شکار ہوئے لوگوں میں سے جو بھی کورٹ جانے کو تیار ہوئے ہیں، ان سب کے مقدمات کی پیروی کاروان نام کا ایک این جی او کر رہا ہے۔ یہ خدمت بالکل مفت فراہم کی جا رہی ہے اور ان کی بازیابی کی کوشش بھی۔ یہ این جی او مسلمان نہیں چلا رہے

ہیں۔ یہ تنقید برائے تنقید نہیں ہے، دکھانا صرف یہ تھا کہ ہماری ترجیحات کا رخ کس سمت میں رہتا ہے۔

مارشل میکلوہن (Marshal McLuhan) نے، جسے جدید کمیونی کیشن تھیوریز کا باوا آدم کہا جاتا ہے، ایک بڑا ابلیغ جملہ لکھا ہے: The medium is the message یعنی میسیج سے زیادہ اہم میڈیم ہے اور فی زمانہ اس سے بڑی سچائی کوئی نہیں ہے۔ ہماری تیاری یہاں بھی اچھی نہیں ہے۔ انگلش تو خیر ایک عالمی زبان ہے لیکن یہ ملک جہاں ہم رہتے ہیں وہاں اب کمیونی کیشن کی زبان ہندی ہے۔ اردو دھیرے دھیرے سمٹ رہی ہے۔ خود مسلمانوں کی موجودہ نوجوان نسل اردو سے ناواقف ہے۔ میں دوسروں کو کیا الزام دوں میرے بچے بھی اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے، سواب اردو میں لکھ کر ہمارا کام نہیں بننے والا نہیں ہے۔ اردو داں طبقہ تو ویسے بھی ہمارا ہمنوا ہے۔ ہم زیادہ سے اس کی معلومات میں تھوڑا اضافہ کر سکتے ہیں لیکن اردو کے ذریعہ اغیار تک نہیں پہنچ سکتے۔ انگلش یا ہندی میں ہمیں اپنی استعداد بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی ساری زبانیں اللہ کی تخلیق ہیں اور وہ ہر خطہ کی ہوتی ہیں، مذہب کی نہیں۔

کبھی کبھی دشمن سے بھی سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا ایک طبقہ صبح سے شام تک یہودیوں کو گالی دینا اپنا دینی منصب سمجھتا ہے لیکن کیا کبھی ہم نے یہ غور کیا کہ جو قوم اس صدی کے اوائل میں در بدر اور ماری ماری پھر رہی تھی اچانک دنیا پر قابض کیسے ہوگئی،؟ صرف سازش اور مکاری سے یہ مقام حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی میں جو بھی دریافتیں ہوئی ہیں، ان میں سے زیادہ تر یہودی ذہن کی مرہون منت ہیں۔ ہم انھیں دشنام بھی دیتے ہیں اور ان کی ایجادوں کو دھڑلے سے استعمال بھی کرتے ہیں۔ یہودیوں نے دو چیزیں اپنے قبضہ میں کر لیں اور اس کے ذریعہ پوری دنیا بھی، فائنانس اور میڈیا۔ کیا ہم ان سے کچھ سیکھنے کو تیار ہیں؟

●❀●

جمہوری ملک میں جمہوری صحافت

صفی الرحمٰن نبیل

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے۔ یہاں کا سماج تکثیری سماج ہے،اس ملک اوراس معاشرہ میں متعدد مذاہب کے پیروکار رہتے ہیں۔جس طرح ہمارا ملک جمہوری ہے اسی طرح ہماری صحافت کو جمہوری ہونا چاہیے جس طرح ہمارا سماج تکثیری ہے اسی طرح ہماری صحافت کو بھی تکثیری صحافت کا کردار ادا کرنا چاہیے۔

اصل مضمون پر گفتگو کرنے سے پہلے اس اصول کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ ایک تکثیری سماج میں اور ایک جمہوری ملک میں آخر وہ کون سا اصول ہوگا جس پر تمام لوگ متفق ہوں گے۔جس میں سب کے لیے فائدہ ہو۔کیا ایک تکثیری سماج میں کسی ایک مذہب کا قانون سب کے لیے فائدہ مند ہوسکتا ہے؟ ظاہر سی بات ہے ایسا بالکل نہیں ہوسکتا ہے، پھر آخر وہ کون سی چیز ہوگی جس پر سب متفق ہوں گے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ایک ایسی چیز جسے سب مل کر بنائیں یعنی ایک ایسا قانون جو عوام کی آواز پر اور ان کی ضرورتوں کے پیش نظر عمل میں آئے نہ کہ مذہب اور دین کی بنیاد پر۔ ہندوستان کا قانون دنیا کا سب سے بڑا قانون ہے۔ ہمارے ملک میں قانون عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے بنتا ہے، ہندوستانی قانون نہ بہت زیادہ rigid ہے اور نہ بہت زیادہ flexible ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں ترمیم کرنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی ہے، لیکن قانون میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہیں basic structure کا درجہ دیا گیا ہے۔

Kesavananda Bharati vs state of Kerala 1973

سپریم کورٹ نے اس میں پارلیمنٹ کو ترمیم کرنے کا حق واپس دے دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ basic structure میں کوئی بھی ترمیم نہیں کی جاسکتی ہے:

Fundamental rights can be amended by the parliament, but without disturbing the basic structure of the Constitution.

بیسک اسٹرکچر کیا ہے؟

☆Supremacy of the Constitution.

☆Rule of law.

☆The principal of separation of powers.

☆Federalism and secularism.

☆Judicial review.

اور بھی دیگر بہت سی چیزیں ہیں جو بیسک اسٹرکچر میں شامل ہیں، اور مزید چیزیں بھی کورٹ کے ذریعے شامل کی جاسکتی ہیں۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ ہندوستانی قانون اس ملک میں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے نہایت عمدہ ہے، اور ایک تکثیری سماج میں اس سے بہتر قانون کی امید نہیں کی جاسکتی ہے، ایسا کہنے پر ہم اس لیے مجبور ہیں کیوں ہمارے قانون میں کچھ بنیادی چیزوں کو بیسک اسٹرکچر کا درجہ دے دیا گیا ہے، یہی وہ چیز ہے جس پر ہم بین المذاہب تعلقات کو مضبوط کر سکتے ہیں، یہ ایک اصولی گفتگو ہے ہم کو اس بات سے بحث نہیں ہے کہ موجودہ حکومت کس طرح کا قانون پاس کر رہی ہے کیوں کہ ہم آگے اس پر بحث کریں گے۔

ایک تکثیری سماج میں مسائل اور مصیبتیں ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہیں کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں جو کسی خاص مذہب یا گروہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایسے مسائل میں جس کا تعلق تمام لوگوں سے ہے، جیسے غربت، سیلاب، قحط، کوڈ 19 وغیرہ ایسے مسائل میں تمام لوگ ایک ساتھ آواز بلند کرتے ہیں کیوں کہ اس کا تعلق تمام لوگوں سے ہوتا ہے، لیکن ایسے مسائل جس کا تعلق کچھ خاص لوگوں سے ہوتا ہے جیسے دلت، اب دلت کا مسئلہ پورے ملک کا مسئلہ نہیں ہے لیکن کیا یہ مسئلہ صرف دلت کے ہونے کی وجہ سے انہی کا مسئلہ ہے، اس کے لیے وہی آواز بلند کریں گے ان کے مسائل کے حل میں دیگر لوگ ان کا ساتھ بھی نہیں دیں گے؟ یہ کسی عمدہ سماج کے لیے ایک اچھا طریقہ نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے، یہی صورتِ حال مسلمانوں کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مسائل میں ملک کے دیگر لوگ ہمارے ساتھ شامل نہیں ہوتے ہیں۔

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے۔ میڈیا کو جمہوریت کا چوتھا ستون مانا جاتا ہے۔ آپ تصور کیجیے کہ میڈیا کی کتنی اہمیت ہے۔ اب یہ بھی تصور کیجیے کہ ایک جمہوری ملک میں ہماری صحافت کو یعنی مسلمانوں کی

صحافت کوایک اقلیتی طبقہ کی حیثیت سے صحافت کرنا چاہیے۔ جیسا کہ ہم ابھی تک کرتے آئے ہیں یا کوئی اور طریقہ ہو،ممکن ہے کہ لوگوں کو یہاں ہم سے اختلاف ہو جائے لیکن ذرا رک کر گزشتہ ستر سالوں پر غور کیجیے اور ہمیں بتائیے کہ کیا ہندوستان میں ہم نے ایک ایسا پلیٹ فارم بنانے کی کوشش کی جہاں مذہب کے اختلاف کے باوجود ہم متحد ہو سکیں، کیا ہماری جماعتیں چاہے وہ دینی جماعت ہو یا سیاسی جماعت کوئی ایسی جماعت وجود میں کیوں کر نہ آسکی جو ایک جمہوری ملک میں جمہور کی قیادت کے لیے آواز بلند کر سکے، ہمارے مدارس یا اسکول کیا جمہور کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس طرح کے متعدد سوالات ہیں، یہ تمام کام ہم نے نہیں کیا۔ ہم صرف اور صرف ایک اقلیتی طبقہ کی حیثیت سے اپنے مسائل میں ہی پڑے رہے اور دیگر اقلیتی گروہ اور جمہور کے مسائل سے ہم کو کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ کیا یہ رویہ اس امت کے لیے صحیح ہوسکتا ہے جو خود کو سارے جہان کے لیے ایک پیغام کی حامل امت گردانتے ہیں، ظاہر سی بات ہے یہ رویہ کبھی بھی درست نہیں ہوسکتا ہے، کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی بڑی تعداد اسی بیماری میں مبتلا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک بار ہمارے سیاسیات کے استاد کہنے لگے کہ کیا آپ لوگ کبھی اس بات پر غور کرتے ہیں کہ کیوں آپ کی یونیورسٹی کی خبر کبھی بھی فرنٹ پیج پر شائع نہیں ہوتی ہے؟ انھوں نے مزید کہا کہ اس کے بالمقابل جے این یو کی خبر ہمیشہ فرسٹ پیج پر رہتی ہے؟

وجہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ آپ لوگ ہمیشہ اپنے مسائل میں الجھے ہوئے رہتے ہیں۔ ملک میں کیا ہورہا ہے، آپ نہ سوچتے ہیں اور نہ بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی خبر نہ کے برابر ہوتی ہے۔ دوسری جانب جے این یو جہاں ملک کے مسائل پر ہمیشہ گفتگو ہوتی ہے۔

بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اگر ہم انبیاء کرام کے طریقۂ کار پر غور کریں گے تو ہم کو یہ بات معلوم ہوگی کہ انہوں نے ہمیشہ تمام لوگوں کے مسائل کے لیے آواز بلند کی۔ اس کے بدلے میں انہیں اجر نہ ملا لیکن انہیں سکون ملا۔ اس طرح سے کہ ان کی محنتوں کے نتیجے میں لوگ جہنم سے جنت کے راستے پر چلے آئے۔ آپ ذرا غور کیجیے حضرت خدیجہؓ کے الفاظ پر جب انہوں نے آپ ﷺ کو پہلی وحی کے بعد تسلی دی ہے۔ (حضرت خدیجہؓ نے کہا: ''اے ابوالقاسم! میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتی ہوں، آپ یقیناً ایسے نہیں ہیں اللہ تعالی آپؐ کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز نہیں کرے گا۔ کیوں کہ میں جانتی

ہوں کہ آپ سچ بولنے والے انتہائی امانت دار، محاسن اخلاق کے حامل اور صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔''

(سیرت ابن اسحٰق، محمد بن اسحٰق بن یسار، ص ۱۵۹)

آخر میں ہم ہندوستانی مسلمانوں، دینی اور سیاسی جماعتوں سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ اللہ کے واسطے اپنی روش سے باز آجایئے اور اس طریق پر کام کیجیے جس طریق پر انبیاء نے کام کیا۔ اگر چہ اس میں نو سو سال ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ ہندوستان کے تکثیری سماج میں لوگوں سے تعلق کو مضبوط کرنا چاہیے اور ان کے مسائل کو اپنا مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ ایک سال قبل ہم روڈ پر تھے۔ سی اے اے کے خلاف آخر آج ہم روڈ پر کیوں نہیں ہیں؟ کیونکہ آج مسئلہ ہمارا نہیں ہے۔ یہ تو کسانوں کا مسئلہ ہے۔ کیا یہ رویہ ایک عمدہ رویہ ہوسکتا ہے۔ ہم کو یہ نہیں دیکھنا ہے کون ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ کیوں اس لیے کہ اس وقت دنیا میں ہم وہ واحد قوم ہیں جس کے پاس ساری انسانیت کے لیے ایک پیغام ہے۔ اس لیے، ہم مسلمانوں کو ایک جمہوری ملک میں جمہوری صحافت کے اصول پر کام کرنا ہوگا۔ ایک تکثیری سماج میں ایک تکثیری صحافت ہی میں کامیابی ہے۔ آخر میں ہم چند نکات پر اپنی گفتگو ختم کرتے ہیں:

۱۔ ایک ایسی جماعت کا قیام جو جمہوری ملک میں جمہور کی قیادت کر سکے۔

۲۔ ایسے اسکولوں کا قیام جو جمہوری ملک میں جمہور کی نمائندگی کر سکیں۔

۳۔ ایسی طلبہ تحریک جو تکثیری سماج میں تکثیری صحافت کا کردار عملی دنیا میں پیش کرے۔

۴۔ ایسے لوگ جو جمہوری ملک میں جمہور مسائل پر لکھیں اور آواز بلند کریں۔

۵۔ مسائل مذہب کے نہیں عوام کے ہوں، تا کہ سب کا مسئلہ بن سکے اور ہماری قیادت مثبت قیادت ہو نہ کہ منفی قیادت، ہماری آواز عوام کی آواز ہو عوام جو مسلمان بھی ہیں اور ہندو اور دیگر بھی ہیں۔ ہماری آواز بھی مثبت ہو نہ کہ کسی کے خلاف ہو تا کہ ہماری آواز اور مشن لمبا سفر طے کر سکے۔

یہ سوال متعدد ذہنوں میں پیدا ہوسکتا ہے کہ موجودہ صحافت کیوں نہیں جمہوری صحافت بن جاتی۔ یقیناً یہ ایک اہم سوال ہے، لیکن دوسرا بڑا سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ صحافت کے حامل لوگ ساری انسانیت کی بھلائی کے علم بردار ہیں یا دوسرے لوگ ہیں جن کا یہ اعلیٰ مشن ہے، ظاہر سی بات ہے موجودہ لوگوں کے پاس نہ کوئی اعلیٰ اخلاقی مشن ہے اور نہ ہی انسانیت کی بھلائی کے وہ علم بردار ہیں؟ جب ان میں یہ بنیادی صفت نہیں ہے تو ان سے اس بات کی امید رکھنا درست نہیں ہے۔ ہم کو اپنے مشن کے مطابق ان تک دین کی دعوت کو پہنچانے کا کام کرنا چاہیے۔

منتشر سماج میں میڈیا کا کردار

ابوعبداللہ فلاحی

میڈیا کسی بھی سماج میں ایک بہت ہی اہم اسٹاک ہولڈر ہوتا ہے۔ جو لوگوں کو اہم معلومات فراہم کرتا ہے اور تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتا ہے۔ پہلے ریڈیو، اخبارات اور ٹیلی ویژن میڈیا کے اہم وسائل ہوا کرتے تھے، جو معلومات فراہم کرتے تھے۔ میڈیا کا بنیادی مقصد جدید سماج میں یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے سوال کرے جو اقتدار اور پوزیشن میں ہیں۔ ایسے بہت سارے واقعات ہوئے ہیں جہاں میڈیا نے رپورٹنگ کے ذریعہ ہنگامہ پیدا کیا ہے۔ مثال کے طور پر کئی سارے صحافیوں کی ایک تنظیم نے ایک عالمی کرپشن کے معاملہ کو اجاگر کیا ہے، جس کو لوگ پانامہ پیپر کے نام سے جانتے ہیں۔ تاہم آج کے دور میں جھوٹی خبریں استعمال کر کے زیادہ تر معاملات میں میڈیا لوگوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ سوشل میڈیا کے آجانے کے بعد سے یہ بیماری مزید بڑھ گئی ہے۔

میڈیا کی تصویر کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم لوگ میڈیا کے مقاصد کو پیش نظر رکھیں۔ میڈیا کے بنیادی مقاصد یعنی علم پیدا کرنا، معلومات میں اضافہ کرنا، لوگوں کو ضروری معلومات سے باخبر کرنا، تازہ صورت حال سے عوام کو واقف کرانا، ایسے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم دینا جو کسی بھی سیاسی دباؤ سے ہٹ کر کچھ لکھنے پڑھنے میں مشغول ہوتے ہیں، افسوس میڈیا ان بنیادی مقاصد سے بھٹکتا جا رہا ہے اور اپنے مقاصد سے منحرف ہوکر پروپیگنڈا ایجاد کرنے اور اسے پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ہرمن اور چومس کی کتاب The Political Economy of Human Rights میں لکھتے ہیں کہ خصوصاً جہاں امریکہ کی زیادہ معاشی اور سیاسی دلچسپی ہوتی ہے، ایسے معاملات میں چاہے وہ دوست ممالک ہوں یا ایسے ممالک جن سے ان کے رشتے اچھے نہیں ہیں، ماس میڈیا عموماً ایک پروپیگنڈا مشین کے طور پر کام کرتا ہے۔

بھارت کے تناظر میں بھی میڈیا ایک پروپیگنڈا مشین کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ چاہے یہ کووڈ-۱۹ کا ابتدائی دور ہو جس میں میڈیا نے مسلمانوں کو موردالزام ٹھہرایا۔ یہ بات کہتے ہوئے کہ تبلیغی جماعت نے

قصداً کورونا وائرس کو پھیلایا ہے، تا کہ بھارت اور یہاں کی عوام کا نقصان ہو۔ متعدد گرفتاریاں ہوئیں اور مسلمان ڈر اور خوف کے سایے میں جینے لگے۔ چند مہینوں کے بعد ممبئی ہائی کورٹ نے تبلیغی جماعت پر لگائے گئے سارے الزامات سے بری کر دیا اور صاف کہا کہ یہ سارے الزمات بالکل بے بنیاد ہیں اور تبلیغی جماعت کو بلی کا بکرا بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد تمام ہی کورٹ نے یکے بعد دیگرے تبلیغی جماعت پر لگائے سارے الزامات واپس لیے اور انہیں بری کر دیا۔

منتشر سماج میں میڈیا لوگوں کو بانٹنے اور جوڑنے، یعنی دونوں کام کر سکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ میڈیا عموماً اکثریت کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے کیوں کہ یہ اس کے لیے مالی اعتبار سے سودمند ہے۔ روانڈا جو کہ افریقی ملک ہے، کے قتل عام میں میڈیا کا رول ایک ٹیکسٹ بک مثال کے طور پر دیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں روانڈا کی نسل کشی میں میڈیا بالخصوص ریڈیو نے لوگوں کو بانٹنے میں اہم رول ادا کیا تھا اور اکثریت کو اکسایا تھا کہ اقلیت کی نسل کشی کرے۔ روانڈا میں دو بڑے گروپ ہیں، ہوتو اور توتسی، ہوتو کی آبادی تقریباً اسی فیصدی ہے اور توتسی کی آبادی تقریباً دس فیصدی ہے۔ ہوتو نے توتسی کی نسل کشی کی جو تقریباً تین مہینے تک چلی۔ جس میں تقریباً ۷۰/ فیصد توتسی کو قتل کر دیا گیا جن کی تعداد تقریباً آٹھ لاکھ تھی۔ بچوں نے بچوں کو مارا، دوستوں نے دوستوں کو مارا، بوڑھوں نے بوڑھوں کو اور عورتوں نے عورتوں کو مارا۔ اس نسل کشی کے پیچھے جو ذہن سازی کی گئی تھی، وہ وہاں کے پرائیویٹ ریڈیو کے ذریعہ سے کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر ۱۹/ جون ۱۹۹۴ء کی ایک شام کو ریڈیو جس کا نام آر ٹی ایل ایم ہوا کرتا تھا، اپنے پروگرام کا آغاز اس طرح سے کرتا ہے: ''سارے کا کروچوں کے لیے پیغام ہے۔ روانڈا ان لوگوں کا ہے جو اس کی حفاظت کرتے ہیں اور تم کا کروچو! روانڈا کے اصلی باشندے نہیں ہو۔ کا کروچوں کو شکست دینے کے لیے ہر کوئی ہتھیار اٹھا چکا ہے۔ جس میں ملٹری کے لوگ بھی ہیں۔ نوجوان بھی ہیں، جوان بھی ہیں، مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی ہیں۔ اس لیے تم کا کروچوں کو بھاگنے اور بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ توتسی بہت کم تعداد میں ہیں۔ اب تو یہ دس فیصدی بھی نہیں رہے اور آٹھ فیصد ہی ہیں۔ تو اب ہم جشن منائیں گے کہ کا کروچ ختم ہو جائیں گے۔ آؤ دوستو! اب ہم جشن منائیں۔ گاڈ بہت مہربان ہے اور رحم کرنے والا ہے۔ اگر ہم سارے کا کروچوں کو ختم کر دیں تو ہمارے اوپر کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوگا کیوں کہ ہم ہی فتح مند ہوں گے۔ بصورت دیگر کیونڈی میں ہمیں ڈوب جانا پڑے گا۔''

اس اقتباس میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یہ ہمارے آس پاس ہونے والے واقعات اور میڈیا میں استعمال کیے جانے والے الفاظ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر پال گھر مہاراشٹر کا ایک واقعہ جس میں دو پنڈتوں کو قتل کر دیا گیا تھا اور قتل کرنے والے بھی ہندو ہی تھے، اس کیس کو فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا اور

ارنب گوسوامی اپنے ایک شو میں اس طرح سے معاملہ کو پیش کرتا ہے کہ ''بھارت میں جہاں ہم ہماری آبادی ۸۰ فیصد ہندو ہیں۔ یہاں ہندو ہونا اور گیروا پہننا پاپ ہوگیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں اور پوچھتا ہے بھارت کہ اگر کوئی مولوی اور پادری کو اس طرح مارتا تو کیا لوگ شانت رہتے؟''

ایسے معاملات ہمیں ہر شام ٹی وی اسکرین پر دکھائی اور سنائی دیتے ہیں، جس میں اقلیتوں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، جو انھیں دہشت گرد اور ملک کو نقصان پہنچانے والا دکھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسانوں کے مظاہرہ کو خالصتان سے جوڑ کر انہیں دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

۲۰۰۳ء میں انٹرنیشنل کریمنل ٹریبونل فار روانڈا International Criminal Tribuanl For Rwanda نے تین صحافیوں کو نسل کشی کے معاملہ میں مجرم قرار دیا، ان پر نسل کشی کے لیے بھڑکانے کا الزام لگا، سازش کرنا اور انسانیت کے خلاف جرم کرنا، کے معاملات میں ماخوذ کیا گیا۔ اس فیصلہ کے بعد Juornalism as genocide کی اصطلاح ہمارے سامنے آئی۔ سوچترا وجیان جو کہ ایک ہیومن رائٹس ایکٹویسٹ ہیں، روانڈا کی نسل کشی کو راہل کنول جیسے صحافت کرنے والوں سے مشابہت قرار دیتی ہیں اوران کی بھی صحافت کو Juornalism as genocide کہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ نفرت ایک بہت بڑی تجارت ہے اور اس سے بھاری کمائی ہوتی ہے۔ کچھ اسی طرح سے بھارت کی سیاست داں جن کا نام کویتا کرشنن ہے، وہ راہل کنول کو صحافت کے کوڑے دان میں رکھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کی یہی جگہ ہے۔ یہ دونوں خواتین راہل کنول کے اس پروگرام کے بعد ایسا کہنے پر مجبور ہوگئیں جس میں راہل کنول نے معصوم اور مجبور مدارس اور مدارس کے بچوں کو کووڈ۔۱۹ کا ہاٹ اسپاٹ قرار دیا تھا۔

میڈیا ایک بہت ہی اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ نیا ریٹیو بنانے یا اس کے نہ بننے دینے میں بھی۔ مثال کے طور پر کووڈ۔۱۹ نے یہ واضح کیا کہ کووڈ۔۱۹ کو روکنے میں سرکار کی ناکامی کو چھپانے کے لیے یہ نیریٹو (Narrative) بنایا گیا کہ مسلمان کورونا جہاد کررہے ہیں۔ اسی طرح سے سوشانت سنگھ راجپوت کی خودکشی کا جو اپی شوڈ ہے، اس کو آمدنی بنانے کا ایک ذریعہ بنایا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ مرکزی حکومت کے موافق اس معاملہ کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس معاملہ میں ایک نوجوان ممبئی میں مقیم خاتون جو بنگالی ہے، اس کو اس پورے معاملہ میں شکار کے طور پر دکھلایا گیا جو کہ بہت آسان تھا۔ بعد میں اس خاتون کو بھی ممبئی عدالت نے بری کردیا۔

پروپیگنڈا مشین کام کیسے کرتی ہے؟ انفارمیشن اور علم دونوں کے ساتھ ایک بہت بڑی پریشانی یہ ہے کہ

عوام تک جلدی نہیں پہنچتا ہے اور پہنچتا بھی ہے تو بہت مشکل سے پہنچتا ہے۔ لیپ مین اپنی کتاب Public Opinion میں لکھتے ہیں: ''جو ماحول ہے، اپنے آپ میں بہت بڑا ہوتا ہے، بہت پیچیدہ ہوتا ہے اور اس سے بہت دور ہوتا ہے کہ ہر انسان تک بلا واسطہ پہنچ میں آئے۔'' یہاں جو گیپ یا دوری بنتی ہے، وہ ایجاد کی ہوئی انفارمیشن اور فیک نیوز کا ایک گراؤنڈ زیرو بنتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اس ذہنی سوچ جس میں وہ یہ مانتے ہیں کہ خاص گروپ کے لوگ ایسے ہوتے ہیں اور خاص جگہ سے آنے والے لوگ ایسے ہوتے ہیں، اس سوچ کو ایسی منطق اور مطمحِ نظر کے ذریعہ استحصال کیا جاتا ہے جو جو میڈیا کے لیے آمدنی کا ذریعہ ہو اور حکومت کے پروپیگنڈا مشین کے طور پر کام کرے۔

ایک ایسے ماحول میں بھارت کی میڈیا نے اپنا بنیادی کام جو کہ حکومت سے سوال کرنا ہوا کرتا تھا، کو چھوڑ کر ایسے نیریٹو (Narrative) بنانے لگا، جس سے لوگ مزید بٹنے لگے اور حکومت بغیر سوال و جواب کے آگے بڑھتی رہی۔

کسی بھی خبر کو آگے بڑھانے سے پہلے اس بات کی تحقیق کر لی جائے کہ یہ بات یا خبر صحیح ہے یا غلط ہے؟ بنیادی طور پر جس دن میڈیا یہ تمیز کرنے لگے گا کہ صحیح اور غلط میں فرق کیا ہے اور صرف صحیح خبر کو آگے بڑھائے گا، اس دن میڈیا پر لگے الزامات مٹ جائیں گے اور سماج کی تقسیم در تقسیم کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔

جس دن ہم لوگ یہ بات سمجھ جائیں گے کہ ہم یہ جھوٹی خبریں کیوں پھیلا رہے ہیں، اس دن یہ بات بھی سمجھ جائیں گے کہ یہ میڈیا جھوٹی خبریں کیوں پھیلاتا ہے؟ جس دن ہم ان جھوٹی خبروں سے بچنے کا راستہ پالیں گے اس دن ہم میڈیا کو بھی سمجھا سکیں گے کہ وہ جھوٹی خبروں سے کیوں کر اور کیسے بچے؟

شخصیات

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ : ایک عظیم سیرت نگار

ڈاکٹر ضیاءالدین فلاحی

اس تحریر کا مقصد ساؤتھ ایشیا کے معتبر سیرت نگار پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (۲۶ر دسمبر ۱۹۴۴ء-۱۵ر ستمبر ۲۰۲۰ء) کے علمی و تحقیقی گوشوں کا تعین و تعارف ہے۔ راقم کا احساس ہے کہ استاد گرامی (۱) نے بھارت اور پاکستان کے علمی و ثقافتی رشتوں کو سیرت نبوی کے حوالہ سے نہ صرف توانا کیا بلکہ اسے تاریخی اعتبار بخشا ہے۔ کلاسیکی اور جدید سیرت نگاری نیز اس کی متنوع و وسیع جہات و ابعاد نے انھیں عالمی سطح کا نقوش ایوارڈ ۱۹۸۴ء میں عطا کیا۔ جس کا تسلسل ۲۰۰۲ء میں شاہ ولی اللہ سیرت ایوارڈ کی شکل میں قائم رہا۔ 'اخبار جنگ' اور 'رائٹرز' کے اخباری اداریوں نے انھیں امت مسلمہ کا مشترکہ عالمی سیرت نگار قرار دیا تھا۔ ان کا ذکر خیر اور استفادے کی دنیا ان کی زندگی میں شاد و آباد ہو چکی تھی۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انتقال کے بعد ان کی باقیات صالحات کا چرچا و تعارف ہوتا کہ سیرت کے گوشے نمایاں ہوں اور استفادہ مزید ہو۔

مختصر شخصی احوال

محمد یٰسین مظہر صدیقی ندویؒ (۲۶ر دسمبر ۱۹۴۴ء - ۱۵ر ستمبر ۲۰۲۰ء) کا آبائی وطن گولا گوکرن ناتھ، ضلع لکھیم پور کھیری، یوپی بھارت ہے۔ والد ماجد مولوی حاجی انعام علیؒ اور والدہ ماجدہ بی بی تسلیم تھیں، ان کی بنیادی و اصلی تربیت دادا استاذ حضرت سید سعید اختر خیرآبادیؒ نے محبت و شفقت سے فرمائی۔ وہ مدرسہ حیاتیہ اسلامیہ گولا کے صدر مدرس اور قصبہ کے امام و مربی تھے۔ جنھوں نے سیکڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کو زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ دوسرے استاد گرامی مولانا غلام محمدؒ تھے جو نومسلم تھے۔ اور دارالعلوم دیوبند کے قدیم فرزند گرامی اور قرآن و توحید کے بڑے معلم، ان کی نگرانی اور تدریس نے قرآن مجید، اردو نثر و ادب، اسلامی علوم سے واقفیت اور ہندی و سنسکرت کی ابتدائی تعلیم بھی دی۔ دادا نے ہجرت پاک کے بعد بھی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کی ہدایت پر ہی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ مولوی احمد رفیع ندویؒ خاص اتالیق تھے، جو امام جامع مسجد اور خطیب و مدرس بھی تھے۔

۱۹۵۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عالم، ۱۹۶۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ سے فاضل ادب اور ۱۹۶۲ء میں ہائر سیکنڈری، ۱۹۶۵ء میں بی اے جب کہ ۱۹۶۲ء میں بی ایڈ (تمام جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے)، ۱۹۶۸ء میں مسلم یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے، ۱۹۶۹ء میں ایم فل اور ۱۹۷۵ء میں ریسرچ اسسٹنٹ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۷ء میں اسی شعبہ میں لکچرر، جب کہ ۱۹۸۳ء میں شعبہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر اور ۱۹۹۳ء-۲۰۰۶ء کے دوران اس شعبہ میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

۵۰۰ سے زائد مقالات اور ۵۰ سے زائد علمی و تحقیقی کتب کے مصنف ہیں۔تصنیف رجال کی گنتی ہزاروں میں ہے۔مصنف گرامی اپنی تصنیفی کوہکنی کی بابت کہتے ہیں کہ اس صبر آزما عمل اور دقت طلب تحقیق میں انگلیاں تو فگار ہوئیں اور جسم و جان شکست و ریخت سے دوچار ہوئے لیکن علمی و تحقیقی اور روحانی لحاظ سے مراحل علم پرور اور فیض بخشی سے گزرتے رہے...میری تحقیق و مضمون نگاری میں بھی اور ان سے زیادہ سیرت نگاری میں افکار و مضامین غیب کی پرکاری نے ایسی نگارشی بھول بھلیوں میں چکر دیے ہیں کہ عقل حیراں ہے، مگر جذبہ مسرور و مفتخر، کثرت مطالعہ کی منطق میں اسے علم کے چھلکنے سے تعبیر کرتے ہیں۔استاذ گرامی کو دیگر انتظامی عہدوں کا بھی تجربہ ہوا۔سید حامد، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یون ورسٹی کے عہد میں آفتاب ہال کے پرووسٹ (۱۹۸۴ء-۱۹۸۶ء) رہے۔ صدر شعبہ علوم اسلامیہ کا دورانیہ ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۸ء، اور ۲۰۰۰،۲۰۰۲ء رہا۔اپریل ۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۶ء ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل مسلم یونیورسٹی مقرر کیے گئے۔ڈین فیکلٹی سوشل آف سائنسز (قائم مقام مختلف اوقات میں) دوسرے مراکز و جامعات کے بورڈ آف اسٹڈیز فیکلٹی، ریسرچ کمیٹی اکیڈمک کونسل اور امتحانات مختلف ملکی و غیر ملکی جامعات میں ممتحن پی ایچ ڈی اور پروفیسروں کی تقرری کے بیرونی ماہر رہے۔قومی و بین الاقوامی سمیناروں اور مراکز، مجالس و مذاکرات میں تاعمر حصہ لیا۔(۲)

فن تاریخ سے دل چسپی

پروفیسر صدیقی کی اصل حیثیت مؤرخانہ ہے جس کی تربیت انھوں نے شعبۂ تاریخ میں دوران ایم اے پائی تھی اور جس کی تکمیل معروف مؤرخ پروفیسر خلیق احمد نظامی (۱۹۲۵ء-۱۹۹۷ء) کے اشراف میں ۱۹۷۵ء میں ہوئی، جہاں وہ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۷ء ریسرچ اسسٹنٹ بھی رہے۔اگر چہ دہلی سلطنت (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) اور مغل سلطنت (۱۵۲۶ء-۱۸۵۷ء) کے مختلف پہلوؤں پر ان کی نگارشات وقیع ہیں۔ان میں سیاسی تاریخ سے زیادہ سماجی، تہذیبی اور علمی تاریخ نمایاں تر ہے اور جن کی طرف مؤرخین کی توجہ ذرا کم ہی رہتی ہے۔دہلی

سلطنت کی معاشی تاریخ پر پروفیسر صدیقی کا کام کلیدی نوعیت کا ہے، لیکن ان کا اصل میدان تحقیق خلجی عہد کے ایک عظیم شاعر امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۳-۱۳۲۵) کی تاریخی مثنویاں اور دو نثری کتب: خزائن الفتوح اور اعجاز خسروی کی تدوین، تحقیق اور تصویب ہے۔ امیر خسرو پر پروفیسر موصوف کا کام دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ 'اعجاز خسروی' کو انگریزی میں منتقل کرنے کے سلسلے میں امریکہ کی سوسائٹی آف امیر خسرو نے انھیں اپنی ٹیم میں شامل کیا تھا۔

اہم بات یہ ہے کہ موصوف کی تاریخ نویسی کا بیش تر حصہ ان کی سیرت نگاری کا بھی حصہ کہلاتا ہے اور یہ ان کی اہم سیرتی حیثیت کو نکھارتا ہے۔ عہد وسطیٰ اور اسلامی تاریخ پر ان کے چند مقالات اور کتب کی فہرست درج ذیل ہے:

۱-خلجی خاندان، اردو ترجمہ 'ہسٹری آف دی خلجیز' مؤلفہ کے.ایس.لال، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء

۲-عہد نبوی میں شامی تجارت، السیرہ عالمی، کراچی

۳-عبدالمطلب ہاشمی- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا، اسلامک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ۱۲۰/

۴-سید الشہداء حمزہ، علی گڑھ، ۲۰۱۸ء، ص ص: ۲۰۸

۵-تاریخ تہذیب اسلامی، (پانچ جلدیں)، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ۲۰۱۲ء

متعدد کتب کا ذکر زیر تکمیل منصوبے کے تحت پروفیسر صدیقی نے کیا جن میں سے کچھ نام یہ ہیں:

۱-حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی- ایک تاریخی مطالعہ

۲-ابوطالب بن عبدالمطلب ہاشمی- ایک تجزیاتی جائزہ

۳-حضرت ولید عقبہ اموی- ایک مطعون صحابی

۴-حضرت مروان بن حکم اموی- شخصیت اور کارنامے

بعض چیدہ تاریخی مقالات

۱-تاریخ اسلامی کے عہد ساز موڑ بعثت نبوی، ۳ قسطیں، نقوش لاہور، ۱۹۹۰ء-۱۹۹۲ء-۱۹۹۳ء

۲-خاندان بنوعبد مناف کے دو سماجی طبقات، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۲۰۰۳ء

۳-بنوعبد مناف، عظیم تر متحدہ خاندان رسالت، معارف، اعظم گڑھ، فروری و مارچ ۱۹۹۶ء

۴-تاریخ یعقوبی، سیرت نبوی کا ایک اہم قدیم ماخذ، نقوش لاہور، رسول نمبر ا، شمارہ ۱۳۰، دسمبر ۱۹۸۲ء

۵-مؤرخ یعقوبی اور فقہائے اسلام، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۶ء
۶-عہد نبوی میں ہاشمی اور اموی روابط، مجلّہ الفرقان، ڈومریا گنج، جولائی-اگست ۱۹۹۷ء
۷-مکی مواخات-اسلامی معاشرہ کی اولین تنظیم، معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۹۷ء-جنوری ۱۹۹۸ء
۸-آراضی ہند کی شرعی حیثیت ایک تاریخی جائزہ، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۲۰۰۰ء
۹-بدایونی کی نجات الرشید، خدا بخش جرنل، پٹنہ، دسمبر ۲۰۰۰ء
۱۰-امام طبری کی تہذیب الآثار-ایک تجزیاتی مطالعہ (مشمولہ فخر الدین علی احمد یادگاری مجلّہ)
۱۱-حضرت مروان بن حکم اموی اور امام بخاری، الماثر، مئو، اگست-اکتوبر ۲۰۰۰ء، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری مارچ ۲۰۰۱ء

عظیم سیرت نگار

برصغیر پاک و ہند کے علمی حلقوں، مدارس اور دانش گاہوں کے مذاکروں اور معروف مجلّات میں پروفیسر صدیقی کی اصل عرفی حیثیت ایک عظیم سیرت نگار کی قرار پاتی ہے۔عظمت و اعتراف کے اسباب میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔انھوں نے فنی طریقہ کار اور تحقیقی منہج کی جو تربیت شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پائی تھی، اس تعلیم و تربیت کا اظہار انھوں نے اپنی جملہ تخلیقات اور خطبات میں کیا ہے۔اس کا جوہری نقطہ یہ ہے کہ وہ انتہائی علمی، معروضی اور اسلامی تناظر میں اپنی تحقیقات پیش کرتے ہیں۔جن میں نقد و نظر کی کارستانی مرکزی اور اصلی ہوتی ہے۔

۲۔وہ تمام دستیاب ماخذ و مصادر-اصل اور ثانوی-سے مواد حاصل کرتے ہیں، دونوں میں فرق کرتے ہیں، جدید و قدیم معلومات کو صحیح حوالوں اور اصل متنی عبارتوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔جمع و تدوین کے لحاظ سے ان کی تصنیفات اور ان کے حواشی و تعلیقات قاموس بن جاتے ہیں۔

۳۔مصادر و ماخذ سے روایات و معلومات کے اخذ و استفادہ میں صحیح ترین اور مفید مطلب روایات کو پیش کرتے ہیں اور ترک و قبول کا مدار صحیح اسلامی اصول اور تنقیدی اقدار رہتا ہے

۴۔مصادر و ماخذ سے روایات و معلومات کے اختلاف و تضاد کے درمیان تطبیق کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور اسے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصنیفات کے مطالعہ کی برکت قرار دیتے ہیں۔اصول ترجیح و تطبیق میں وہ نقد و نظر

کے مسلمہ جدید اصول اور تنقیح وتجزیہ کے صحیح اور معتبر اسلامی رویے کو اختیار کرتے ہیں۔

۵۔ تاریخ نگاری اور سیرت نگاری کے عمل میں وہ اندرونی اور بیرونی عناصر اور شہادتوں کی تمیز وتفریق کو لازمی قرار دیتے ہیں اس قدر عالی کو امام فلسفہ ابن خلدون کی تاریخ کے مطالعہ وکسب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محض ظاہری واقعات اور نوشتہ معلومات تاریخ نہیں ہیں، وہ تاریخ کے ظاہری پہلو ہیں، جن کو اندرونی رباطنی پہلو اور عناصر وجود بخشتے ہیں، ان کی تمام تخلیقات میں ان دونوں عناصر کی جلوہ فرمائی ہوتی ہے۔

برصغیر پاک وہند کے سیرتی ادب کا کلید بردار

ساؤتھ ایشیا کے اس خطے میں جن درجنوں رجال بست وکشاد نے علمی، فنی اور تحقیقی اسالیب میں سیرت نگاری کے جوہر بکھیرے ہیں ان میں ایک اہم نام پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا ہے، جنھوں نے اپنے تحقیقی مقالات وکتب، خطبات اور پی ایچ ڈی مقالات کی نگرانی وممتحنی کے طویل علمی سفر کے ذریعہ ہندوپاک کے علمی رشتوں کو مستحکم کیا ہے۔ ذیل میں چند نمائندہ واقعات وکوائف پیش کیے جاتے ہیں، جن کے ذریعہ ان کی جہاتِ سیرت نگاری، محبین ومحسنین کی شیفتگی اور فنی وتحقیقی قدروں کا ایک عکس ہمارے سامنے آسکے گا۔

ا- جولائی ۱۹۸۲ء میں لاہور کے نقوش کے رسول نمبر کے لیے یعقوبی کی سیرت پر لکھنے کی درخواست ڈاکٹر اجمل ایوب اصلاحی حفظہ اللہ نے کی۔ انگریزی میں مقالہ جب مدیر نقوش جناب میاں محمد طفیل کی خدمت میں پہنچا تو اسے اردو کا قالب عطا کرنے کی درخواست اور شامل نقوش کرنے کی خوش خبری ان الفاظ میں سنائی:

''آپ کا علم اور میرا پاگل پن مل کر ایک بڑا کام کر جائیں گے۔''

مسلسل ومتواتر پانچ مقالات کے بعد جب ۱۹۸۴ء میں عظیم سیرت نگار ڈاکٹر نثار احمد کے ساتھ پروفیسر صدیقی کو نقوش ایوارڈ ملا تو اخبار جنگ کی شعلہ نوائی نے ایک ہندوستانی کو عالمی سیرت نگاران کی فہرست میں لا کھڑا کیا۔(۳)

۲-مغرب ومشرق کے معروف دانش ور جناب خرم مرادؒ (۳رنومبر ۱۹۳۲ء-۱۹ردسمبر ۱۹۹۶ء) کی بابت اپنی کتاب رسول اکرم ﷺ اور خواتین: ایک سماجی مطالعہ کی تقدیم میں لکھتے ہیں:

> اصلاً ان بارہ مضامین کو ایک رسالہ کے بارہ شماروں کے لیے لکھا گیا تھا اور اس کی تحریک اس ماہ نامہ کے ایک دردمند مدیر کی اسلامی خواہش سے ملی...ہم دونوں کا اس امر پر اتفاق تھا کہ مردوزن کے اسلامی اختلاط اور سماجی تعلقات کی جو تصویر بنتی ہے وہ اسلامی عہد اور نبوی

زمان میں اس سے کافی مختلف تھی جو آج اصول واحکام کی روشنی میں بنائی اور بتائی جاتی ہے۔ لہٰذا طے ہوا کہ خاکسار راقم خالص تاریخی وواقعاتی شہادتوں کی تابندگی میں مختلف مضامین کی صورت میں اسے رقم کرے... اصلاً یہ مضامین یا ابواب کتاب اس محترم ومحبوب رفیق وصدیق نادیدہ کی یاد میں اس کے محبوب رسالے کو پیش نظر رکھ کر مختصر مختصر لکھے گئے۔(۴)

۳- برصغیر ہندوپاک کے معروف مصنف، محقق اور سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری حفظہ اللہ کی علمی سرپرستی اور نقد ونظر میں وسیع الظرفی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر صدیقی علمی دنیا میں اپنی شہرت ومعنویت کو تحقیقات اسلامی کا تحفہ واحسان قرار دیتے ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ فروری ۱۹۸۲ء کی اولین اشاعت میں مولانا سید جلال الدین عمری نے میرا مضمون 'تاریخ اسلام میں شان نزول کی اہمیت' چھاپ دیا، حالاں کہ یہ مضمون مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، قائد وبانی جماعت اسلامی کی شہرہ آفاق کتاب: خلافت وملوکیت کے ایک نقطہ تحقیق پر نقد واستدراک تھا...تحقیقات اسلامی کا اولین مقالہ اگرچہ تفسیر وتاویل کا معاملہ بادی النظر میں لگتا ہے لیکن وہ اصلاً سیرت نبوی کا ایک واقعہ ہے اور اس کی تحقیق وتنقید نے موقف مودودی کی کمزوری ثابت کی۔... بہرحال ان دونوں جرائد (ترجمان القرآن، تحقیقات اسلامی) کے مدیران گرامی میرے حق میں 'سیرت نگار گر' ثابت ہوئے۔ سید مودودی نے سورۂ حجرات، آیت ۶'' **ان جاء کم فاسق بنباءٍ فتبینوا**...'' کی تاویل میں یہ قول نقل فرمایا: ''**لااِختِلاف فِي تَاوِيل هٰذِهِ الآية بَيْنَ الْعُلَمَاء**...'' الخ اور اپنا موقف اس سے مستند کیا کہ صحابی جلیل حضرت عقبہ بن ابی معیط اموی ہی اس کے مصداق ہیں۔ پروفیسر صدیقی کہتے ہیں کہ پڑھتے ہی فکر ونقد نے اندر سے آواز دی کہ تاویل تفسیر آیت میں علماء کا اختلاف نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ سیرت وتفسیر، حدیث وفقہ اور علم وفن کے تمام شعبوں میں اختلاف کی حکم رانی ہے۔... پروفیسر صدیقی نے معارف اعظم گڑھ کی احسانات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے مدیران میں بطور خاص ضیاء الدین اصلاحی اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نیز مولانا حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی کے نام لے کر شکریہ ادا کرتے ہیں۔

۴- عالمی شہرت یافتہ علماء وفضلاء، محبین ومحسنین، اساتذہ اور دیگر مقتدر ہستیوں کی توجہات، کرم فرمائیوں اور بندہ نوازی کا ذکر خیر کرتے ہیں۔ اپنے مشرفِ گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی کی دل جوئی اور شاباشی کا تذکرہ اپنی کتاب: Organisation of Government Under the Prophet کے ضمن میں کرتے ہیں کہ یہ عنوان بھی انہی کا عطا کردہ ہے اور ادارہ ادبیات دلی سے اس کی طباعت بھی انہی کا فیض، جو اس کتاب میں مذکور سیرت پاک کے ضمن میں 'جدولوں' سے بہت خوش اور مطمئن ہوئے (۵) دوسرے مشفق

استاذ گرامی معروف مؤرخ پروفیسر ایمریٹس عرفان حبیب کی شرافت اور عظمت کا تذکرہ کرتے ہیں کہ غزوات و سرایا کی اقتصادی جہات، میں جن طُرق تحقیق کا استعمال کیا گیا وہ نادر کار تصور کی گئیں۔استاد گرامی سے اس کے انگریزی روپ کی تصحیح اور ترمیم و تنسیخ کی غرض سے بار بار کی مراجعت رہی، ایک بار خوش ہو کر فرمایا: مولانا! آپ نے جرمن طریق کار تحقیق (German Methodology of Historiography) کہاں سے سیکھی؟۔(۶)

۵-معروف دانش ور فیصل ایوارڈ یافتہ پروفیسر نجات اللہ صدیقی حفظہ اللہ کی جوہر شناسی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ان کی محبت نے میری کتاب 'غزات وسرایا کی اقتصادی جہات' کو مجھ سے انگریزی میں منتقل کروالیا اور جو مدیر نقوش کی نظر اس قدر بھایا کہ انھوں نے اس کے اردو قالب کی فرمائش کی اور نقوش میں اسے جگہ دی۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقی نے اس کا مختصر تعارف بزبان عربی سعودی عربیہ کے جریدہ کنگ عبدالعزیز جرنل آف اکنامکس میں چھاپ دیا۔انہی کی خواہش پر ایک اور مقالہ لکھا گیا جس کا عنوان ہے:'کیا رسول اکرم ﷺ نے زکوٰۃ ادا کی'۔(۷)

۶-پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی اپنی چوکھی تصنیفی خدمات کے وجود میں لانے کے باعثین میں مزید شخصیات کا ذکر خیر کرتے ہیں۔مثلاً پروفیسر محمد عبدالحق انصاری، سابق امیر جماعت اسلامی ہند اور ڈائریکٹر تصنیفی اکیڈمی، نئی دہلی کی فرمائش پر معیشت نبوی مدینہ میں اور معیشت نبوی مکی دور میں، جسے کتابی شکل میں لانے کا اصرار دونو جوانانِ پاک: محمد عارف کھانچی اور' جنید سلمہ نے کیا'۔(۸) پروفیسر انصاری کے ادارہ میں خلافت اسلامی کے ادوار پر خطبات مسلسل کے نتیجے میں درسیات کی ایک کتاب تاریخ تہذیبِ اسلامی تیار ہوگئی جو بعد میں حواشی و تعلیقات کے اضافوں کے ساتھ پانچ جلدوں میں شائع بھی ہوگئی۔پروفیسر صدیقی 'عہد نبوی کا تمدن' کے اصل محرک مولانا سید طلحہ حسنی ندوی کو قرار دیتے ہیں، جن کی سیرت اور ادھورے کام کو ان کے ایک شاگرد (محمد یٰسین مظہر صدیقی) کو توفیق ملی۔معروف اہل حدیث عالم اور جامعہ سلفیہ بنارس کے سابق مہتمم وصدر مدرس مولانا مقتدیٰ حسن ازہری کی علم پروری کی بابت کہتے ہیں کہ انھوں نے تاریخ نگاری کے مسائل اور اصول، کو عربی زبان میں منتقل کر کے عرب دنیا میں اسے شہرت عطا کی۔(۹)

۷-اسی طرح پروفیسر عبدالرحیم قدوائی حفظہ اللہ کی سیرت نبوی سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اس کارنامہ کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہیں کہ موصوف نے 'سیرت نبوی میں مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل' کو بزبان

انگریزی بعنوان: The Prophet Muhammad (SAW), A Role Model for Muslim Minorities ترجمہ کیا اور اسے لیسسٹر لندن سے شائع بھی کیا۔ مسلم یونیورسٹی کے تین مجلّات: مجلّہ علوم اسلامیہ، فکر و نظر اور تہذیب الاخلاق کو بھی اپنی سیرت نگاری کے قیام میں اہم محرک قرار دیتے ہیں۔ الفرقان لکھنؤ اور الفرقان ڈومریا گنج، ندائے الصفا علی گڑھ، جہات الاسلام لاہور اور الاضواء لاہور کی قدر افزائی بیان کرتے ہیں۔(۱۰)

۸- یہ تذکرہ ناقص رہے گا اگر انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے صدر نشین ڈاکٹر منظور عالم حفظہ اللہ کی علم پروری کا ذکر نہ کیا جائے، جنھیں پروفیسر صدیقی دانش ور، مفکر اور بندہ پرور کے تحسینی کلمات سے یاد کرتے ہیں۔ جن کی جوہر شناسی کے طفیل انھیں مذکورہ ادارے کے علمی و ثقافتی منصوبوں کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا جہاں سے دیگر متعدد کتب کے علاوہ مصادر سیرت کی دو ضخیم جلدیں (۱۴۰۰ صفحات) اور تحقیقات سیرت نگاری پر گراں قدر اضافہ منظر عام پر آسکے۔ اور جہاں کی مجلس علمی کے اکابرین نے پانچویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے لیے موصوف کا نام تجویز کیا۔

گم نام گوشوں کی بازیافت اور خلاؤں کی خانہ پُری

پروفیسر صدیقی کی اردو سیرت نگاری بہت مال دار اور تہہ دار ہے۔ انھوں نے درجنوں وقیع اور نادر گوشوں کو غور و فکر کا موضوع بنایا، پیش رو امامان سیرت کی تقصیرات پر انگلی رکھی اور ان خلاؤں کو پُر کیا جن کی طرف توجہ نہیں دی گئی یا دی گئی لیکن کم کم۔ قدیم سیرت نگاران اور محدثین سے موصوف نے متعدد امور میں اختلاف کیا اور ان کی علمی و تحقیقی نارسائیوں کی وضاحت کی۔ اور عصر جدید میں امت اسلامی کے لیے سیرت نبوی کا عملی نمونہ پیش کیا۔ گم نام گوشوں کا ادراک اور صحیح اسلامی تناظر میں پیش کش کی فکر پروفیسر موصوف کو ۱۹۵۷ء کے زمانہ طالب علمی سے ہی ہو چکی تھی جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا کیا ہے۔ چنانچہ اساتذہ کی دعاؤں اور والد ماجد کی نیک خواہشات اور تمناؤں کے طفیل عہد نبوی کے تمدن کو اپنی کوہنی کا ہدف مقرر کیا۔ اس مرکزی عنوان سے درجنوں کتابوں کی شاخیں نمودار ہوئیں اور سیکڑوں مقالات نے کونپلیں نکالیں۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ چند وقیع عنوانات و موضوعات کے بعض گوشے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً:

۱- معاشِ نبوی (کراچی، ۲۰۱۵/۱۷۲) کے کتابی شکل میں آنے سے قبل پروفیسر صدیقی نے معاشی

مسائل کی مختلف جہتوں کو واضح کرتے ہوئے مشرقی اور مغربی مصنّفین کے الزامات کی تردید کی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب: 'نبوی غزوات کی اقتصادی جہات' کے ذریعہ ثابت کیا کہ غزوہ/سریہ کا مقصد لوٹ مار یا اقتصادی بحران کی تکمیل نہیں تھا۔ چنانچہ اس مکی و مدنی دور کے لاحقے اور سابقے اور ان کی کڑیوں کو جوڑ کر خلاؤں کو پُر کرنے کی طرف اکثر اماماں سیرت نے توجہ نہیں کی یا کی لیکن بہت کم۔ اپنی تحقیق کے لیے شبلی نعمانی کے اس قول: ''سب کے سب نِگھرے نہیں آئے تھے'' سے استدلال کر کے ثابت کرتے ہیں کہ متعدد صحابہ اپنا تمام مال منقولہ اپنے ساتھ لائے اور اپنے ہنر اور محنت سے بہت جلد مدنی معاشرت کو مال داری و تمول عطا کیا۔ عہد مکی میں تجارتی معاہدوں کی قریشی روایت، تجارتی ندیموں کا سماجی و دینی رویہ اور عہد نبوی میں مدنی مسلم معیشت پر مواد کا انبار لگاتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ زکوٰۃ پابندی کے ساتھ ہر سال ادا کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اس تصور کی تغلیط کی ہے کہ امہات المومنین کے گھروں میں سالہا سال چولہے نہیں جلتے تھے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ محمد عربی ﷺ کا فقر مجبوری کا نہیں بلکہ ارادہ کا تھا۔

۲- عہد نبوی میں خواتین کی معاشرت، موصوف کا دل چسپ موضوع ہے۔ اپنی کتاب رسول اکرمؐ اور خواتین - ایک سماجی مطالعہ، میں عام صحابیات اور ازواج مطہرات کی سماجی خدمات اور ان کے حقوق پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی تقدیم میں لکھتے ہیں کہ انسانی سماج میں عورتوں کے کردار اور کارگزاریوں کے باب میں ہمیشہ افراط و تفریط پر مبنی نظریات و اصول کارفرما رہے ہیں... اپنے بہترین زمانہ میں۔ مکی و مدنی دونوں ادوار مبارک میں آپ نے نبوی سماج میں اختلاطِ مرد و زن کا عملی نمونہ مستحکم اور محکم فرمایا۔ اگر یہ زیارات نہ ہوتیں تو خالص سماجی صالح اقدار اور رسوم کے علاوہ بہت سے اسلامی اصول و احکام بھی وجود میں نہ آتے...''۔

اس کتاب کے عنوانات یہ ہیں:

(۱) رسول اکرم ﷺ خواتین کے گھروں میں، (۲) مدنی خواتین کے گھروں میں، (۳) خواتین بیتِ نبوی میں، (۴) کاشانہ نبوی میں مدنی خواتین، (۵) زیارات خواتین اور اشاعت حدیث، (۶) احکام اسلام کا ارتقا اور زیارات خواتین، (۷) غزواتِ نبوی میں خواتین، (۸) خواتین کی تزویج نبوی، (۹) عورتوں کا حق خرید و فروخت اور کسبِ معاش، (۱۰) صحابہ کرام اور خواتین کے معاشرتی تعلقات، (۱۱) عورتوں کی شکایات اور ان کا ازالہ، (۱۲) اختلاط مرد و زن کے نبوی اصول۔(۱۱).

اس میدان میں پروفیسر صدیقی کا اہم کارنامہ ازواج مطہرات کی سیرت نگاری بھی ہے۔ انھوں نے

متعدد مقالات اس ضمن میں مذاکروں میں پیش کیے اور سیرت پاک کے ان گوشوں اور خلاؤں کی تکمیل فرمائی جن کی طرف آج تک توجہ نہیں دی جاسکی تھی۔ مثلاً حضرت خدیجہؓ کے ساتھ یک زرجگی کی زندگی گزارتے ہوئے آخری زمانہ تک رسول پاک ﷺ کو دوسری شادی کا خیال تک نہیں آیا۔ آپ ﷺ نے اس معاملہ میں قبل بعثت اور بعد بعثت عربوں کی سماجی روایت سے انحراف فرمایا۔ قوامیت، حق شوہری اور 'مثنیٰ وثلاث ورباع' کے قرآنی اجازت نامے کے درمیان نبی مکرمؐ کا یہ اسوہ معاشرت نسواں کی نفسیاتی جہت پر غور وفکر کے نئے زاویے ہمارے سامنے روشن کرتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ کے ذریعہ بیان کردہ رویائے صادقہ کو پہلی وحی قرار دیتے ہیں، جب کہ عام سیرت نگاران، ۱۲/ربیع الاول اور نبوت کے اکتالیسویں سال میں ''اقرأ باسم ربّک ''...الخ کو پہلی وحی قرار دیتے ہیں۔ حضرت خدیجہ کے حوالے سے بے شمار واقعات کی تنزیل ربانی کا تذکرہ کرتے ہیں، جو حضرت عائشہ کی طویل حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ فترہ وحی اور تنزیل ربانی، ہجرت نبوی وصحابہ، غزوات وسرایا، واقعہ افک، قرطاس کا مسئلہ، امامت اور متعدد امور میں نئے نئے گوشوں کو حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ بنت حارث اور حضرت حفصہؓ کے حوالوں سے جمع وتسوید فرما کر سیرت نگاری میں قابل تحسین اضافے کرتے ہیں۔ (۱۲)

۳-'عہد نبوی میں سیرت فاروقی' (دہلی ۲۰۱۵/۴۷۰) علم وتحقیق کی دنیا میں علامہ شبلی کی الفاروق پر اضافہ اور توسیع ہے۔ گرامی یٰسین نے مکی عہد کے عمر بن الخطاب عدوی کی سیرت نگاری پر وہ گوشے تفصیل سے پیش کیے ہیں جنھیں شبلی گرامی نے پس منظر کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس تصنیف کے ذریعہ جہاں خلاؤں کو پُر کیا ہے، وہیں اس موضوع کی نئی جہات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جہاں یہ واضح کیا گیا ہے کہ عمر بن الخطاب کو دربار نبوی سے الفاروق کا لقب دراصل مکی عہد کے عمر کے امتیازات کے سبب عطا ہوا تھا وہیں دوسری طرف مدنی عہد میں تکمیل سیرت نبوی کی بھی جھلکیاں اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں۔ نا قابل التفات معاملات ومسائل اور تشنہ تکمیل امور وواقعات کی سیرت نگاری گرامی صدیقی کا شوق وطلب ہے۔ ان کی کتب اور مقالات کے عنوانات سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ چنانچہ مکی اکابرین کی سیرت نگاری اور واقعات کی چھان پھٹک پر ان کی استعداد وقدرت کا اظہار کیا جانا چاہیے۔ اس کتاب کی بابت لکھتے ہیں کہ شبلی کی کتاب غیر فانی خلیفہ دوم کے کارناموں کی تاریخ وتحقیق ہے۔ خادم وخوشہ چینِ شبلی کی کتاب الفاروق کی تعمیر شخصیت اور خلیفہ دوم کی بنیاد کی بازیافت ہے۔ (۱۳) اس کتاب میں اضافات صدیقی کے جلو میں اس کے محتویات کا ایک

عکس قارئین کی خدمت میں پیش ہے:

(۱) سیرت نبوی کا ایک باب سیرت فاروقی، (۲) اسلام کے بارے میں موقف، (۳) قبول اسلام کے بعد کے واقعات، (۴) ہجرت فاروقی، (۵) غزواتِ نبوی میں سیرت فاروقی، (۶) عہد نبوی میں مناصبِ فاروقی، (۷) فاروقی تعلقات، (۸) فضائل ومناقب فاروقی، (۹) علوم وفنونِ فاروقی، (۱۰) اختتام نبوی- تکمیل سیرت نبوی۔

۴-مسلم اقلیتوں کے مسائل (کراچی ۲۰۰۸ء/۳۲۰) اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے۔ خصوصاً آج کے تکثیری معاشروں میں اسلامی کردار کی بازیافت کے لیے یہ کتاب رہ نما اور گائیڈ کا کام دے سکتی ہے۔ احادیث نبویہ اور مصادر سیرت کی روشنی میں گلوبل ولیج کے تمام مسلمانوں کے لیے اس کتاب میں غور وفکر اور تعمیر وترقی کے راستوں اور طریقوں کی رہ نمائی ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر لیسسٹر، لیڈن، لندن سے اس کا انگریزی قالب پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے چھاپا جس کا عنوان گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔

۵-اضافاتِ صدیقی کا ایک روشن باب ان کی تحقیقی وتنقیدی نگارشات ہیں۔ یہ اضافات، مضامین ومواقع سیرت نبوی میں جگہ جگہ نمایاں ہوتے ہیں لیکن قدیم وجدید سیرت نگاران اور مصادر سیرت کی چھان پھٹک میں ان کے قلم کی جولانی پوری آب وتاب کے ساتھ ان کی کتاب مصادر سیرت (دو جلدیں) میں نمایاں ہے۔ دوسری جانب پروفیسر صدیقی کے اداریوں/تقدیموں اور خطبات کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ اس ضمن میں موصوف کا ایک اہم وقیع مقالہ قابل استفادہ ہے، جس کا عنوان ہے: سیرتِ نبوی کے ماخذ پر جدید اردو تحقیقات، جو ۲۶-۲۸/مارچ ۲۰۱۱ء کے عالمی سمینار بعنوان: دور جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات میں پیش کیا گیا تھا۔ اپنی تحریر میں موصوف نے مشرقی ومغربی مصنّفین (مسلم وغیر مسلم) کے علاوہ برصغیر پاک وہند کی چند چیدہ ہستیوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے تسامحات کا تعاقب کیا ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے دیگر امامانِ سیرت کے جلو میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ، ڈاکٹر محمود احمد غازی، مولانا عبدالرؤف داناپوری، عبدالماجد دریابادی اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی خدماتِ سیرت نگاری پر بھی کلام کیا ہے۔ موصوف گرامی نے شبلی اور سلیمان ندوی کی خدمات سیرت کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو دبستانِ شبلی کا خوشہ چیں قرار دیا ہے۔ (۱۴)

پاک کے دانشوروں کی پذیرائی

پروفیسر صدیقی نے اپنی علمی وتحقیقی تشکیل میں محسنین کی ایک کہکشاں آباد کر دی ہے۔ انھوں نے بجا طور

پر اعتراف کیا ہے کہ وہ جہانِ سر سید اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تعلیم وتربیت کے فیض یاب ہیں۔انھوں نے خود کو خوشہ چینِ شبلی قرار دیا ہے۔گرامی یٰسین نے طفیل محمدؒ، خرم مرادؒ، پروفیسر سعید اختر، سید عزیز الرحمٰن، حافظ محمد عارف گھانچی اور درجنوں محبین کا تذکرہ کیا ہے جن کی علم پروری کے طفیل بھارت اور پاک کے علمی وثقافتی رشتے مضبوط ہوئے ہیں۔استادگرامی نے مذاکروں کے داعیین، اخبارات اور مجلّات کے مدیران کا نام بنام اور کہیں عمومی تذکرہ بھی کیا ہے۔درحقیقت یہ سب مشترکہ میراثِ سیرت نگاری کے طفیل ممکن ہوسکا، جو امت اسلامی عالمی کے لیے اتحاد واتفاق کا سنگ میل ہے۔

برصغیر پاک وہند کے عظیم سیرت نگار نے مختلف تاریخوں میں متعدد موضوعات پر پاکستان کی یونیورسٹیز، مدارس اور علمی دانش گاہوں میں خطبات اور مقالے پیش کیے ہیں۔جن کی تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔بہت سارے خطبات یوٹیوب کی شکل میں موجود ہیں۔بعض ہنوز ریکارڈ باکس میں منتظر محققین ہیں۔امید ہے محنتی ریسرچ اسکالرز انھیں منظر عام پر لائیں گے۔ذیل میں ان خطبات کے چند عنوانات پیش کیے جاتے ہیں جو مطبوعہ شکل میں موجود ہیں:

۱-خطبات سرگودھا (مکی عہد کے دینی، سماجی، تمدنی، سماجی اور معاشی مباحث)

۲-خطبات سیرت، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد، (مصادر سیرت کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ)

۳-اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد (خطبات اسلام آباد)

۴-سرگودھا اور ہزارہ یونیورسٹی (خطبات سیرت، مدنی عہد کی تعمیر میں مکی دور کا کردار)

۵-دارالعلم والتحقیق کراچی (خطبات سیرت: ماخذ ونگارش کا تجزیہ)

۶-مسندِ سیرت وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی (عہد نبوی میں قریش وثقیف کے تعلقات)

۷-زوار اکیڈمی کراچی (خطبات سیرت کا غیر روایتی ماخذ)

خلاصہ بحث

سطور بالا میں عظیم سیرت نگار پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ کی علمی وفنی نیز تحقیقی اور تنقیدی نگارشات کا ایک مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔اس مختصر مقالے میں موصوف کی جہاتِ سیرت نگاری کی کسی ایک اقلیم کا بھرپور تعارف پیش کرنا بھی ممکن نہیں ہوسکا۔راقم کا خیال ہے کہ پہلی فرصت میں استاذ گرامی کی پچاس سے زائد تصنیفات اور پانچ سو سے زائد مقالات کا تعارف نہایت ضروری ہے تاکہ محققین وباحثین کو گرامی یٰسین کی

سیرت نگاری کا علم وتعارف مل سکے اور دوسرے مرحلہ میں نقد واحتساب کی قدروں کے ذریعہ ان کے کام کی توسیع ممکن ہو سکے۔ امید ہے دونوں ممالک کے محبین سیرت نبوی اس جانب خصوصی توجہ دیں گے۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ استاذ گرامی سے براہ راست استفادہ اسلامک اسٹڈیز میں ایم. اے. (۱۹۹۳ء-۱۹۹۴ء) کے دوران ہوا، جب ان کی علمی فتوحات اپنے شباب پر تھیں۔ انھوں نے Islamic Historiography کا پرچہ پڑھایا۔ ہر ہفتہ وعشر میں نقوش، تحقیقات اسلامی، معارف، فکر ونظر یا تہذیب الاخلاق کے لیے سیرت کے جدید اور اچھوتے موضوعات پر طبع زاد مقالات کی خوش خبری دیا کرتے اور مستقبل کے خاکوں کی نوید سنایا کرتے تھے۔ استاذ گرامی سے راقم کی پہلی ملاقات ۲۶-۲۸/فروری ۱۹۸۷ء میں جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ میں دوران فضیلت سال اول ہوئی، جب ڈاکٹر صدیقی اپنا مقالہ 'فن تفسیر کے ارتقا میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا حصہ' پیش کرنے کے لیے وہاں مدعو کیے گئے تھے۔ یہ مقالہ ششماہی علوم القرآن علی گڑھ جولائی-دسمبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس موقع پر میرے مشرف عالی استاذ محترم پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی حفظہ اللہ نے بھی 'عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں فقہ اسلامی کا ارتقا' کے عنوان پر اپنا وقیع مقالہ طلبہ واساتذہ جامعۃ الفلاح کے سامنے اس موقع پر پیش فرمایا تھا۔ شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مشرفِ گرامی کو محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ راقم کو استاذ الاساتذہ پروفیسر صدیقی سے دوران پی ایچ ڈی بار بار فنی اور تحقیقی امور میں مراجعت کا موقع ملتا رہا۔ ۱۰/ستمبر ۲۰۲۰ء کو آخری ملاقات میں استاذ محترم نے کہا کہ ''۴-۵ نومبر ۲۰۲۰ء کے عالمی سیرت کانفرنس، لاہور میں تم نہیں جا سکو گے۔ دسمبر تک پروازیں کورونا وائرس کے سبب منسوخ رہیں گی، میں نے بھی پاکستان کے محبین سے سے معذرت کر لی ہے''۔ افسوس کہ ۱۵/ستمبر ۲۰۲۰ء ۱۲ بج کر ۲۵ منٹ پر یہ عظیم سیرت نگار سرطان کے مرض کی وجہ سے اپنی کمائی کی اجرت لینے اپنے منعم حقیقی سے جاملا۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ مرحمت فرمائے۔ آمین

۲۔ یہ معلومات استاذ گرامی کے بائیوڈاٹا سے ماخوذ ہیں جو خود ان کا تیار کردہ ہے۔ نیز دیکھیں: مقالہ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی: میری سیرت نگاری کی کہانی: مشمولہ ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سیرت نگاری، مرتبین: پروفیسر عبیداللہ فہد/ ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی، پبلی کیشن ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۲۰ء، ص ۵۲، ۲۲

۳۔ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی، میری سیرت نگاری کی کہانی، ص: ۲۶، و مابعد

۴۔ اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص xv-xiv، اس اقتباس میں سید مودودی کے جاری کردہ رسالہ ترجمان القرآن کی طرف اشارہ ہے، جس کے مدیران میں ایک فائق نام خرم مرادؒ کا بھی ہے۔

۵۔ میری سیرت نگاری کی کہانی، ص:۲۶

۶۔ میری سیرت نگاری کی کہانی، ص:۳۱

۷۔ میری سیرت نگاری کی کہانی، ص:۳۰

۸۔ میری سیرت نگاری کی کہانی، ص:۴۳

۹۔ میری سیرت نگاری کی کہانی، ص:۲۹، حافظ محمد عارف گھانچی کو کتب سیرت کی فہرست سازی اور اشاریہ سازی سے خصوصی شغف ہے۔ وہ کتب خانہ سیرت کراچی کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ محمد جنید انور، ریسرچ ایسوسی ایٹ سیرت چیر جینڈر اسٹڈیز اینڈ ویمن رائٹس جامعہ پنجاب ہیں۔

۱۰۔ میری سیرت نگاری کی کہانی، ص:۲۹

۱۱۔ راقم نے موصوف کے موخر الذکر مقالے کا تقابلی مطالعہ عصر جدید کے معروف عرب مصنف شیخ ابوعبدالرحمٰن عبدالحلیم محمد ابوشقہ (وفات:۱۹۹۵ء) کی کتاب المرأۃ فی عصرِ الرّ سالہ کے ایک باب سے کیا ہے، دیکھیے مقالہ راقم: نبوی معاشرت میں خواتین کی حصہ داری (سدالذریعہ کے شرعی اصول کا نفاذ)، مشمولہ Empowerment of Women under the Prophet of Islam، سیرت کمیٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء، ص ص ۲۴۸-۲۶۶

۱۲۔ مذکورہ معلومات ۲۰ رمارچ ۲۰۱۸ء میں دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد علامہ اقبال آڈیٹوریم میں دوپہر کی نشست میں پیش کردہ خطبہ سے ماخوذ ہیں جس کی صدارت جناب سہیل حسن صاحب نے فرمائی تھی ایک گھنٹہ ۱۴ منٹ کا یہ خطبہ ازواج مطہرات کی سیرت نگاری کے عنوان سے یوٹیوب پر دستیاب ہے۔ https://www.facebook.com۔ ازواج مطہرات کی سیرت نگاری پر موصوف نے شبلی کالج اعظم گڑھ کے سیرت سمینار کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد طاہر کے زیرنگرانی کئی مقالات پیش کیے ہیں، جو زیرطبع ہیں۔

۱۳۔ میری سیرت نگاری کی کہانی، ص:۴۳

۱۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیں مقالہ راقم: محمد یٰسین مظہر صدیقی کی اردو سیرت نگاری، چند گوشے، حیات نو، دہلی، اکتوبر، ۲۰۲۰ء/۴-۸،۔ ۲۰۱۱ء کے عالمی سمینار اسلام آباد میں بھارتی قافلہ کے ساتھ راقم بھی شامل تھا۔ میرے مقالے کا عنوان تھا: سیرت نگاری میں ہندو اہل علم کا حصہ، جو مقالات سیرت سمینار میں شائع ہوا، دیکھیں: دور جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات، مرتبہ: مبشر حسین/عبدالکریم عثمان، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء/ ۱۷۹-۲۲۹

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز

محمد مشتاق فلاحی

موت وحیات کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کہتا ہے: إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (یونس: ۴۹) ''جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم وتاخیر بھی نہیں ہوتی۔'' انسان کے سینہ میں دل بھی اسی رب نے رکھے ہیں جس نے اسے زندگی سے نوازا ہے۔ اسی لیے یہ دل خوشی و مسرت میں اس قدر شاداں وفرحاں ہوجاتے ہیں کہ چہروں سے فرحت ہویدا ہوجاتی ہے، اور رنج وغم میں آنسوؤں کے ذریعہ بہہ بھی جاتے ہیں۔ کچھ غم تو ایسے ہوتے ہیں جن کا نہ مداوا ہوسکتا ہے اور نہ ہی نعم البدل، جب یاد آئے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور اپنے مرد قلندر کے بچھڑ جانے کا احساس شدید تر کر جاتی ہے۔ ع

عجب قیامت کا حادثہ ہے، کہ اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمین کی رونق چلی گئی ہے، اُفق پہ مہر مبین نہیں ہے
تری جدائی سے مرنے والے، وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

کچھ ایسا ہی معاملہ گزشتہ رات پیش آیا۔ جب ڈاکٹر محمد رفعت صاحب (سابق کل ہند صدر ایس آئی ایم اور رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند) کے اچانک انتقال کی اطلاع آئی۔ طبیعت کی بے چینی ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ ایسے وقت جب کہ امت مسلمہ اور خود تحریکات اسلامی فکری بحران سے گزر رہی ہے، ڈاکٹر صاحب جیسے بےلوث و بے باک قائد کا چلے جانا کسی قیامت خیز حادثہ سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے انتقال سے ہم جیسے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کارکنان تحریک اسلامی کا غم میں مبتلا ہوجانا واجبی ہے۔ اس لیے کہ وہ نہ صرف بھارت کی پہلی کل ہند طلبہ تنظیم ایس آئی ایم کے پہلے منتخب کل ہند

صدر تھے بلکہ اسی حوالے سے ہمیشہ ہماری مرشدی کرتے رہے۔طلبہ تنظیم کے کارکنان کی علمی وفکری تعلیم و تربیت میں مرحوم کا اہم حصہ تھا۔شروع ہی سے آپ سادگی پسند، انتہائی ذہین، سخت سے سخت مسائل کو بھی آن واحد میں حل کرنے والے اور فکری اعتبار سے مضبوط ترین واقع ہوئے تھے۔گویا اقبال کے ان اشعار کی عملی تفسیر تھے:

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ،ضرب ہے کاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لیے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری وکراری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایہ کلہ داری

طلبہ تنظیم کے کارکنان کے لیے وہ ہمیشہ مرجع تھے۔ڈاکٹر صاحب کی اسی مخلصانہ رہ نمائی نے طلبہ کو ہمیشہ آپ سے جوڑے رکھا۔طلبہ تنظیم سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد آپ نے جماعت اسلامی ہند میں شمولیت اختیار کی اور اپنے علمی وفکری ذوق، متانت وسنجیدگی کی وجہ سے صرف طلبہ تنظیمی نہیں بلکہ پورے تحریکی حلقہ میں متعارف ہوتے چلے گئے۔جماعت اسلامی ہند میں مختلف ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی ادا کرتے ہوئے مرکزی ذمہ داریوں تک پہنچے۔چنانچہ آپ مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے، تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی کے چیرمین رہے، اسلامی اکیڈمی ٹرسٹ کے بانی ٹرسٹی، اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کے وزٹنگ فیکلٹی بھی تھے۔آپ نے ایک عرصے تک جماعت اسلامی ہند کے ترجمان 'زندگی نو' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔آپ کی قلم سے اب تک ۱۵/ کتابیں اور سیکڑوں مقالے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو جاننے والے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ نہایت ہی کم سخن ہونے کے ساتھ ساتھ حق گو اور بے باک انسان تھے۔طلبہ تنظیم اور وحدت اسلامی ہند کے اجتماعات میں پابندی کے باوجود شرکت کرتے رہے، اقبال کے اس شعر کا مرقع کہ

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز

قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

آپ طبیعت کے بہت ہی سادہ تھے، منکسرانہ مزاج، زندگی تصنع سے بالکل عاری، لباس اور بود و باش اتنی سادہ کہ پہلی ملاقات میں نظر ہی میں نہ بھرے۔

بہر حال زمین کے فیصلے عرش سے ہی نافذ ہوتے ہیں۔ وہ رب ہی بہتر جانتا ہے کہ ان پرآشوب حالات میں جب کہ اس کے محبوب نبی کی مظلوم ونحیف امت ڈاکٹر صاحب جیسے جری، مفکر، علمی ثقاہت، قدیم وجدید نظریات پر گہری نظر رکھنے والی عبقری شخصیت کی زیادہ ضرورت مند تھی، کیوں داغ مفارقت دے گئی۔

کہتے ہیں جب قوم کے بڑے گزر جاتے ہیں تب پیچھے والوں کو ان جگہوں کو پر کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر وہ تحریکی فرد جو مرحوم کی فکر ونظر سے قلبی لگاؤ رکھتا ہے اس کی ذمہ داری دو چند ہو جاتی ہے، وہ تحریک اسلامی میں پیدا ہوئے اس خلا کو پر کرنے کی انتھک جد وجہد کرے، خود کو علمی وفکری اعتبار سے مضبوط کرے تاکہ مستقبل میں اہل علم کی کمیابی کی وجہ سے امت نظری وفکری فتنہ کا شکار نہ ہو۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ وہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کا نعم البدل نصیب کرے، آمین۔

فروغ کہکشاں کو ناز ہے جن کی جبینوں پر
یہ تلقینِ خودی پیدا کی وہ نوجواں تونے
انھیں کے زور بازو سے ہے اب گردش زمانے کی
بدل کر رکھ دیا آخر مزاج آسماں تونے

(علامہ اقبال)

ڈاکٹر محمد رفعت: مشفق استاد، مہربان مربی

محمد اسعد فلاحی

مفکر اسلام اور فکرِ مودودیؒ کے شارح ڈاکٹر محمد رفعت ۸؍جنوری ۲۰۲۱ء کو اس دارِ فانی کو خیر باد کہہ گئے۔ ان کی وفات سے عالم اسلام، خصوصاً تحریک اسلامی کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا احساس وابستگانِ تحریک نے جس شدت کے ساتھ کیا ہے، اس کا اظہار الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ علم و تقویٰ، سادگی اور انکساری کا ایسا چلتا پھرتا قابلِ تقلید نمونہ اپنی آنکھوں سے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔ مسکرانا تو جیسے ان کی فطرت میں شامل تھا۔ وسائل کی فراوانی کے باوجود ان کی زندگی تصنع، آرائش و زیبائش اور دنیا کی چمک دھمک سے بالکل پاک تھی۔ بہت سادہ زندگی گزارتے تھے، ان کو دیکھنے اور جاننے والا ہر شخص اس کا شاہد ہے۔ معمولی سی چپل، سادہ سے کپڑے اور چہرے پر مسکراہٹ ان کی شخصیت کی پہچان تھی۔

ڈاکٹر محمد رفعت ۲۶؍جولائی ۱۹۵۶ء خورجہ، ضلع بلند شہر، یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام بندو خان ہے۔ وہ تحصیل دار تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کا تبادلہ علی گڑھ ہوا تھا، اس کے بعد سے وہ وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ ڈاکٹر رفعت صاحب کی ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ انھوں نے منٹو سرکل سے ۱۹۷۱ء میں انٹر کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ۱۹۷۴ء میں بی ایس سی (آنرز)، ۱۹۷۶ء میں ایم ایس سی (فزکس) اور ۱۹۸۴ء میں آئی آئی ٹی کان پور سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی۔ ۱۹۸۵ء میں معروف یونی ورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں آپ کا بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا۔

ڈاکٹر صاحب ایس آئی ایم کے پہلے باقاعدہ صدر تھے۔ جس وقت انھوں نے یہ ذمہ داری اٹھائی اس وقت ان کی عمر صرف اکیس سال برس تھی۔ وہ ۱۹۷۷ء میں جماعت اسلامی ہند کے رکن بنے۔ جس وقت جماعت اسلامی ہند پر پابندی عائد ہوئی اس وقت ان کو بھی سنت یوسفی ادا کرنے کی توفیق ملی۔ ۱۹۸۱ء میں مجلس نمائندگان کے رکن منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب مصروفیات کے باوجود تحریکی سرگرمیوں میں برابر شریک

رہتے۔ وہ ۱۹۹۵ء سے ۲۰۱۱ء تک (چار میقات) امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند دہلی و ہریانہ رہے۔ آپ ۱۹۹۹ء میں مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن ہوئے اور تا حیات اس کے رکن رہے۔ تحریک اسلامی کے ترجمان ماہ نامہ زندگی نو کے مدیر کی حیثیت سے تقریباً دس سال (۱۰) اپنی خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر محمد رفعت صاحب میرے استاد بھی تھے اور مربی بھی۔ اس تعلق سے میں اپنے آپ کو خوش قسمت محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اسلامی اکیڈمی نئی دہلی میں تقریباً دو (۲) برس بحیثیت طالب علم ان سے بھرپور استفادہ، اس کے بعد چار سال (۲۰۱۵ء تا ۲۰۱۹ء) تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند میں ان کے زیر تربیت رہنے کا موقع ملا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ ان کے علم کی گہرائی اور فکر کی پختگی سے اس درجہ تو فائدہ نہیں اٹھا سکا جتنا اس کا حق تھا، البتہ بہت ساری باتیں ان سے ویسے ہی سیکھ اور جان لیں جیسے عطر کے قریب رہنے سے موجود شخص اس کی خوشبو سے معطر ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مجھ سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور اعتماد بھی، اس حد تک کہ گویا میں ان کے گھر کا ایک فرد ہوں۔ وہ بہت کم مجھے اپنے نام سے پکارتے تھے۔ ان کا عمومی انداز مجھے 'جناب والا' کہہ کر مخاطب کرنے کا تھا۔ اتنی بڑی شخصیت کا مجھ جیسے طالب علم کے ساتھ اس طرح محبت اور احترام کے ساتھ سے پیش آنا میرے لیے کسی معجزہ سے کم نہیں تھا۔ عموماً لوگ دنیاوی عہدوں کی بلندیوں کو پا لینے کے بعد اپنے سے نیچے والوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اسے اپنی 'پوسٹ' کی توہین گردانتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ 'چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں کا احترام' والے اصول پر شدت کے ساتھ عمل کرتے تھے۔ لوگوں سے اس طرح محبت سے پیش آتے تھے کہ ایک مرتبہ ملاقات کے بعد عموماً انسان ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

میں ان سے بہت بے تکلف تھا اور وہ مجھ سے۔ کوئی کام بتانے میں تکلف محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ مرکز سے متعلق ان کے بہت سے کام میرے ذریعے انجام پاتے تھے۔ وابستگانِ تحریک کو کتابیں، رفقاء کو ڈائریاں اور کلینڈر دینا ہو یا کسی سے کوئی چیز حاصل کرنی ہو یا پہنچانا ہو، یہ کام میرے ذمے تھے۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو بلا ناغہ گھر بُلا کر اعانت کی رقم مرکز جماعت کے شعبۂ مالیات میں جمع کرنے کے لیے دیتے تھے۔ ان کے اس عمل میں میں نے کبھی تاخیر نہیں دیکھی۔

ڈاکٹر رفعت صاحب کی زندگی میں پروٹوکول نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جو چاہتا بلا تکلف دربانوں اور اپائنمنٹ کے بغیر ملاقات کر سکتا تھا۔ انھوں نے اخلاص سے پُر اور سادگی بھری زندگی گزاری۔ ہمیشہ اس بات کا

خیال رکھتے تھے کہ کسی کے لیے زحمت کا باعث نہ بنیں۔ اسی شانِ نیازی کے ساتھ انھوں نے زندگی کے پینسٹھ (۶۵) برس گزار دیے۔ جس وقت وہ تصنیفی اکیڈمی کے چیرمین تھے، آفس کی صفائی کا اہتمام معمول کے مطابق نہیں ہوتی تھی۔ بسا اوقات ہفتے گزر جاتے تھے، ٹیبل پر زیادہ دھول دیکھتے تو خود صاف کر لیتے تھے، لیکن کبھی شکوہ نہیں کرتے تھے۔ آفس میں جب کبھی وابستگان تحریک ملاقات کے لیے یا کسی اور کام سے آتے تو ان کی خاطر مدارات کے لیے کسی کارکن کی مدد نہیں لیتے تھے، بلکہ خود ان کی تواضع کرتے، خود سے پانی بھر کے پلا دیتے تھے۔ دفتر میں آنے والے مہمانوں کی عموماً لیمن ٹی سے ضیافت کرتے تھے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اس کو مالیات پر بوجھ ڈالنا مناسب نہیں گردانتے تھے۔ البتہ گھر پر ضیافت کرتے تو ان کی فراخ دلی قابلِ دید ہوتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب ذکر واذکار کے بہت پابند تھے۔ جب کبھی دفتری اوقات کے علاوہ اپنے دفتر میں تشریف لاتے تو زور زور سے تکبیرات کا ورد کرتے ہوئے داخل ہوتے اور دیر تک کرتے رہتے۔ کبھی جہراً قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔

ڈاکٹر خالد حامدی کی نگرانی میں شائع ہونے والا رسالہ 'اللہ کی پکار' سے اہلِ علم واقف ہیں۔ اس کا شاید ہی کوئی شمارہ ایسا ہو جس میں تحریک اسلامی پر تنقید نہ کی گئی ہو۔ اس بے جا تنقید کی وجہ سے وابستگانِ تحریک اس سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر رفعت صاحب کی محبت تحریکی حد بندیوں تک محدود نہیں تھی اور نہ انھوں نے کبھی تحریکی حد بندیوں اور فکری اختلافات کو حقوق کی ادائیگی میں رکاوٹ بننے دیا۔ ان کی محبت صرف تحریکی حلقے تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے درد مند دل میں امت واحدہ کو سموئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر خالد حامدی کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ تھا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے مجھے فون کیا اور کہا: ''آپ ذرا مسجد (اشاعت اسلام) کے پاس آجایئے۔'' میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ پہنچا تو دیکھا کہ وہ مسجد کے پاس پہلے سے موجود ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہولیا۔ راستے میں انھوں نے پوچھا: ''کیا آپ خالد حامدی صاحب کو جانتے ہیں؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا اور پوچھا: ''کیا اللہ کی پکار والے؟'' ڈاکٹر صاحب مسکرانے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ خالد حامدی صاحب کی طبیعت بہت علیل ہے۔ وہ کچھ دیر قبل الشفا ہاسپٹل میں ایمرجنسی میں داخل ہوئے تھے۔ فی الحال ٹھیک ہیں اور گھر پر آگئے ہیں۔ ہم انھی کی عیادت کے لیے جا رہے ہیں۔ مزید کہا کہ ان کے پاس فی الحال دیکھ ریکھ کرنے والا کوئی نہیں ہے، جب تک ان کی طبیعت بہتر نہیں ہو جاتی، آپ روزانہ ان سے ملتے رہیے اور ممکنہ ضروریات پوری کرتے رہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب

نے ان کی خیریت پوچھی۔ چلتے وقت میرا تعارف کراتے ہوئے انھیں میرا نمبر دیا اور اس بات کا ذکر کر دیا جو ہمارے درمیان طے ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی علمی گہرائی اور فکری پختگی کا احاطہ کرنا مجھ جیسے طالب علم کے لیے ممکن ہے نہ مجھے یہ زیب دیتا ہے۔ یہ کام اہلِ علم و دانش کا ہے۔ البتہ ان کے قریب رہ کر مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوا کہ ان کی فکر تمام تر کج رویوں سے پاک تھی۔ اس میں کسی طرح کا تزلزل نہیں تھا۔ وہ مولانا مودودیؒ کی فکر کو خالص انداز میں پیش کرتے تھے، اسے توڑنے مروڑنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے وہ تحریکی حلقوں میں شارح مودودیؒ کے نام سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر رفعت صاحب بیک وقت اردو اور انگریزی دونوں زبان کے ماہر تھے۔ لیکن انگریزی زبان کے بے محل اور غیر ضروری استعمال سے گریز کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں اور تقریروں میں غیر ضروری علمیت کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ جنوب کے لوگ، خصوصاً کیرلا والے اردو زبان سے کم واقفیت رکھتے ہیں، ابتدا میں ان کے لیے اس کو سمجھنا بھی دشوار ہوتا ہے، لیکن تھوڑی مدت میں وہ اس پر قابو پا لیتے ہیں۔ ایس آئی او کے کسی پروگرام میں جب کبھی حلقۂ کیرلا کے ساتھی شریک ہوتے تو ڈاکٹر رفعت صاحب اس وقت اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں تقریر کرتے تھے۔ ان کا انداز اس طرح ہوتا تھا کہ پہلے اردو میں ایک مکمل بات کہہ دیتے تھے، اس کے بعد اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی بیان کرتے تھے، تاکہ وہ ساتھی بھی سمجھ جائیں جو اردو زبان سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن انگریزی میں ان کا انداز بیاں اتنا سلیس اور سادا ہوتا تھا کہ اس زبان سے بہت کم واقفیت رکھنے والا بھی اس کو آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ وہ غیر ضروری اور بھاری بھرکم انگریزی الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے تھے۔

رفعت صاحب کی سادگی کا چرچا زد خاص و عام ہے۔ ان کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ اتنی بڑی پوسٹ پر ہونے کے باوجود کی پیڈ موبائل استعمال کرتے تھے اور آخر وقت تک اسی کا استعمال کرتے رہے۔ کسی بھی طرح کی فوٹوگرافی سے اجتناب کرتے تھے۔ البتہ واضح الفاظ میں اس کی روک تھام کے لیے تنبیہ نہیں کرتے تھے، البتہ ذاتی طور پر جہاں تک ہو سکے، اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ ان کو دیکھا کہ جب کبھی کتابوں کے رسم اجرا، یا اس طرح کے دیگر پروگراموں میں وہ فوٹو سیشن کے دوران کتاب یا کسی دوسری چیز سے اپنا چہرہ اس طرح چھپاتے تھے کہ وہ کیمرے میں نہ آسکیں۔ جب منتظمین یا ذمہ داران اس بات کو

محسوس کر لیتے تھے تو وہ چیز اُن کے چہرے سے ہٹوا دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بادلِ ناخواستہ مسکراتے ہوئے ان کی بات پر عمل کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کم گو اور حاضر جواب تھے۔ مشکل اور بڑے سوالات اور اشکالات کا جواب چند جملوں، بسا اوقات چند لفظوں میں دے دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک علمی محفل میں بھائی مصدق مبین نے ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا: ''اگر کوئی شخص 'غیب' کا ترجمہ 'اندھ وشواس' سے کرے تو ہم کیا کریں؟'' ڈاکٹر صاحب نے برجستہ جواب دیا: ''تو ہمیں اس کا ترجمہ کسی اور اسے کروانا چاہیے۔'' اس طرح محفل میں مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی اور حاضرین خوب محظوظ ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب نوجوانوں کی تربیت کے تعلق سے بہت فکر مند رہتے تھے، خصوصاً ان کی فکر کے حوالے سے۔ ان کی اسی محبت اور تڑپ کی وجہ سے وہ ایس آئی او کے چھوٹے چھوٹے پروگراموں میں بلاتکلف شریک ہو جاتے تھے اور نوجوانوں کی رہ نمائی کرتے تھے۔ جس وقت ابوالفضل انکلیو یونٹ کی ذمہ داری مجھ پر تھی، میں نے ان سے بھرپور استفادہ کی کوشش کی۔ اسی دوران ایک اہم پروگرام 'اسٹیفن ہاکنگ کے نظریات کا تنقیدی جائزہ' کے عنوان سے منعقد کیا۔ اس پروگرام کے مقرر جناب ڈاکٹر رفعت صاحب تھے۔ انھوں نے بہت جامع انداز میں اسٹیفن ہاکنگ کے نظریات کے تنقیدی جائزے کے ساتھ اٹھارہویں، انیسویں اور بیسوی صدی عیسوی کی سائنس اور فلسفۂ سائنس کا بہت علمی انداز میں تعارف کرایا۔ الحمدللہ پروگرام بہت کامیاب رہا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر کی ریکارڈنگ اور تحریر میرے پاس موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بعض فکری اور اہم تقاریر بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان شاءاللہ ان کو مرتب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ڈاکٹر رفعت صاحب ایک مشفق استاد اور مہربان مربی تھے۔ انھوں نے اپنے رفقاء کی تربیت تقریروں کے ذریعہ کم اور عملی طور سے زیادہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھوں نے جو علمی ورثہ چھوڑا ہے، ہمیں اس سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

چاند پٹی کی سرزمین سے دوتصویریں

حافظ فیضان احمد فلاحی قاسمی

اعظم گڑھ کی سرزمین کواللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔علمی،فکری،سیاسی،سماجی،معاشرتی۔ معاشی غرض یہ کہ ہرلحاظ سے یہ خطہ آزادی ہند سے ماقبل سے زرخیز رہا ہے،اوراس خطہ کی زرخیزی ہی اس کی نیک نامی اور عالمی پیمانے پرشہرت کا ذریعہ رہی ہے،جس پراہالیان اعظم گڑھ کے لیےفخر وانبساط کے ساتھ ساتھ شکروامتنان کارویہ زیب دیتا ہے،فللّٰہ الحمد والشکر۔

اعظم گڑھ کی خوش نصیبی ہے کہ ہرمسلک اور ہرمکتبۂ فکر کے لیے یہ سرزمین مرجع رہی ہے۔فقہ حنفی کی تاج داری ہو یا اہل حدیث طبقہ کی سرخیلی،دونوں کا رشتہ اسی سرزمین سے ہے۔مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ اور مولانا عبیداللہ مبارک پوریؒ نے اسی سرزمین سے جنم لیا،فہم قرآن کے سرخیل مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور سیرت النبیؐ کے خالق علامہ شبلی نعمانیؒ کی نشوونما بھی اسی آب وہوا میں ہوئی۔مدرسۃ الاصلاح،جامعۃ الفلاح،الجامعۃ الاشرفیہ،جامعۃ الرشاد،جامعہ احیاء العلوم،بیت العلوم نے بھی اس نیک نامی میں اپنا کردارادا کیا ہے۔

لیکن اس نیک نامی کو بچا کر رکھنا اوراس میں چار چاند لگانا نئی نسل کا کام ہے،مگر شاید ہم اس وراثت کو سنبھال پانے میں ناکام ہورہے ہیں۔اس وقت سوشل میڈیا میں چاند پٹی کی دوتصویریں گردش کررہی ہیں۔ ایک تصویر سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ کے مسکن کی ہے،جوان کی بے نیازی، استغنا اور دنیا سے بے رغبتی کی واضح دلیل ہے۔ورنہ طویل ترین عرصے تک ہندوستان کی ایک بڑی جماعت کا قائد اپنے لیے محل تعمیر کراسکتا تھا۔اس کے لیے اسے صرف اشارہ کرنے کی ضرورت تھی اور سیکڑوں ہاتھ اس کام کوانجام دینے میں اپنی سعادت اور خوش بختی سمجھتے۔مگراس شخص نے اس دنیاوی زندگی کوایک مسافر کی حیثیت سے گزار دیا اورابدی زندگی کے لیے پوری جدّ وجہد کو خالص کیے رکھا۔حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابواللیث ندویؒ نے اپنے بعد میں آنے والوں کو مشقت میں ڈال دیا، وہ ایسا اعلیٰ نمونہ چھوڑ گئے کہ اس پر رشک ہی

چاند پٹی کی سرزمین سے دو تصویریں

کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اسی چاند پٹی سے ایک رلا دینے والی تصویر بھی سوشل میڈیا میں گردش کررہی ہے گاؤں کے باہمی چپقلش اور اختلافات نے ایک دینی مدرسہ کو زمین بوس کرنے کا انتظامیہ کو موقع دے دیا۔موجودہ حکومت اور اس کے ناپاک عزائم سے کون ناواقف ہے؟ یہ تو یہی چاہتے ہیں کہ مسلمان آپس میں دست بہ گریباں ہوں، تعلیمی، معاشی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے ان کی کوئی حیثیت نہ ہو، ایسے میں ہماری سادہ لوحی اور نادانی ان کو کھل کر کھیلنے کا موقع دیتی ہیں۔اللہ ان کے شر سے محفوظ رکھے۔

کیا چاند پٹی اور اطراف میں ایسے اہل خرد نہیں تھے کہ وہ مل بیٹھ کر آپسی مسئلہ کو حل کر لیتے؟

کیا مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ کی روح کو ہم اپنے اس رویہ سے تکلیف نہیں پہنچا رہے ہیں؟

کیا بولیثی کردار صرف ہمیں کتابوں میں پڑھنے کو ملے گا؟

فاعتبروا یااولی الأبصار!

Interfaith Dialogue

ایک فتنہ انگیز اصطلاح ہے، جو مسلمانوں کے ذہن کو دعوت کے بجائے غیر مسلموں کے ساتھ ایک کارِعبث میں شرکت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔اکثر مغربی اصطلاحوں کا معاملہ یہی ہے کہ وہ حالات کے درست تجزیے میں معاون ہونے کے بجائے انتشار فکر پیدا کرنے کا کام کرتی ہیں۔امت مسلمہ کے لیے موزوں یہی ہے کہ وہ مغربی اصطلاحات سے اجتناب کرے اور تحقیق اور تجزیے کے لیے خود ایسی اصطلاحات دریافت اور تجویز کرے جو حقائق کی درست عکاسی کرتی ہوں۔

(ڈاکٹر محمد رفعت)

بستی، نیک تاجر اور روشنی کا مینار

صباح الدین اعظمی

کسی زمانے میں سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی۔ یہاں کے لوگ میل ملاپ سے رہا کرتے تھے۔ یہ جگہ عام گزرگاہ سے ذرا ہٹ کر تھی، اس لیے تجارتی قافلے یہاں سے کم ہی گزرتے تھے۔بستی میں چھوٹے بڑے بہت سے تاجر تھے۔خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ان میں سے ایک تاجر کی شہرت رفتہ رفتہ دور دور تک پھیل گئی۔ یہ تاجر بہت خدا ترس اور نیک تھا۔لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔اس تاجر کے تعلقات تاجروں کے ایک ایسے گروہ سے تھے، جو سچائی اور دیانت داری کی وجہ سے ایک عالم میں مشہور تھا۔تاجروں کا یہ گروہ اس راستے سے اکثر گزرتا تھا اور بستی میں قیام کرتا۔بستی والے ان کی بے حد عزت کرتے تھے اور ان کی آمد پر ہر سو ان کا استقبال ہوتا۔تاجروں کا سفر جب زیادہ ہونے لگا تو انھوں نے یہ طے کیا کہ اس علاقے میں روشنی کا ایک مینار تعمیر کیا جائے تا کہ راہ چلنے میں دشواری نہ ہو۔بستی والوں نے کہا کہ یہاں تو پہلے سے ایک چھوٹا سا مینار موجود ہے، اسی کو مزید بلند اور شاندار بنا دیا جائے۔ یہ رائے سب کو پسند آئی اور موجود مینار کی بنیادوں پر ہی ایک شاندار مینار تعمیر کر دیا گیا، جس کی روشنی سمندر میں دور تک جاتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹی سی بستی مشہور ہوگئی اور دور دور سے قافلے وہاں آنے لگے۔بستی کا خدا ترس تاجر آنے والے قافلوں کا خوشی خوشی استقبال کرتا ان کے لیے ہر طرح کی سہولیات مہیا کرتا۔ مینار کی دیکھ ریکھ میں آگے آگے رہتا۔بستی والے خوش و خرم رہتے۔ باہر سے آنے والے ہنسی خوشی واپس جاتے۔

لیکن وقت ایک سا نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ تاجروں کے گروہ میں نئے نئے تاجر شامل ہونے لگے اور نئی ریت ورواج اپنا لیے۔ یہ بات اس نیک دل تاجر کو پسند نہ آئی۔اس نے گروہ کے پرانے تاجروں سے شکوہ کیا لیکن وہ بھی اب بے بس تھے ان کی اب ایک نہ چلتی تھی۔ یہ تاجر بھی اب بوڑھا ہونے لگا تھا باہر سے آنے والے تاجروں نے بوڑھے تاجر کو چھوڑ کر بستی کے دوسرے تاجروں سے تعلقات بنا لیے۔ مینار کی دیکھ ریکھ اور

انتظام میں نئے لوگ داخل ہو گئے۔ ان سب نے مل کر مینار میں ایسی قندیلیں لگا دیں، جو خوبصورت تو بہت دکھتی تھیں، لیکن بہت دھواں دیتی تھیں۔ بوڑھے تاجر کو اس تبدیلی سے بہت دکھ پہنچا۔ اس نے مینار کی تعمیر میں بڑی محنت اور لگن سے حصہ لیا تھا۔ اس سے مینار کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اس نے بہت آواز بلند کی لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔

مینار کا انتظام اب بستی کے نئے تاجروں نے سنبھال لیا تھا۔ بیرونی تاجروں کا گروہ اب ان کا ساتھ دیتا تھا۔ پرانے تاجروں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ بستی کا نیک دل تاجر آواز لگا تا رہا: 'مینار کو سنبھالو! اس کی قندیلیں دھواں دے رہی ہیں'، لیکن نئے تاجروں کا دبدبہ کچھ ایسا تھا کہ اس کی ایک نہ چل سکی۔ بستی والے سب دیکھتے تھے، لیکن بے بس تھے۔ نیک دل تاجر سب دیکھتا رہا۔ اس کا تو اب مینار تک جانا بھی مشکل تھا۔ جاتا بھی تو کیا کر لیتا۔ اس کی وہاں کون سنتا تھا۔ بالآخر ایک دن وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس دن اتفاق سے سب تاجر باہر گئے ہوئے تھے۔ مینار کے ارد گرد سناٹا تھا۔ بستی والوں نے بڑے احترام سے اس کے جنازے کو اٹھایا۔ مینار کے ارد گرد ایک چکر لگایا اور واپس لا کر اس کے جسد خاکی کو اسی جگہ سپرد خاک کر دیا، جہاں اس کے بزرگ پہلے سے دفن تھے۔

بستی اب بھی آباد ہے۔ لوگ اس خدا ترس نیک دل تاجر کو آج بھی یاد کرتے ہیں۔ باہر سے آنے والے تاجر اب بھی آتے ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ بستی والے ان کو اب پہلے جیسا احترام نہیں دیتے۔ بستی والے کہتے ہیں کہ نئے تاجروں کو بستی سے کیا دلچسپی، ان کو مینار سے غرض ہے، جس کی روشنی میں ان کے قافلوں نے تجارت کی اور فائدہ اٹھایا۔ مینار آج بھی قائم ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس کی قندیلیں اب پہلے جیسی روشنی نہیں دیتیں۔

جہاد اور آیات جہاد

مصنف: مولانا ڈاکٹر عنایت اللہ اسد سبحانی، صفحات: ۲۴۰، قیمت: ۲۲۰ روپے
ناشر: ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی

محمد غطریف شہباز فلاحی ندوی

جہاد دہشت گردی کا نام نہیں۔ان دونوں میں اتنی ہی دوری ہے جتنی آسمان وزمین میں۔اسلام اور خوں ریزی کبھی جمع نہیں ہوسکتے جیسے آگ اور پانی جمع نہیں ہوسکتے۔قرآن کریم جو دین کا اولین مصدر ہے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے،سنت قائمہ جاریہ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔البتہ بعض روایات آحاد اوران کی بنیاد پر بننے والی فقہی آرا سے لوگوں کے دلوں میں جہاد اور اسلام کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔اور یہ غلط فہمیاں معمولی نہیں بلکہ اتنی زیادہ عام ہیں کہ اچھے اچھے اذہان ان کا شکار ہیں۔غیر ہی نہیں اپنی صفوں میں پھیلے انھیں نادان دوستوں کی باتوں،نعروں،وعظوں اور بے محابا بیانات سے غیروں کو خوب مسالہ مل جاتا ہے اور وہ دین کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان رخنوں کو بند کیا جائے جہاں سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔اسی مبارک مقصد سے استاد محترم مولانا عنایت اللہ سبحانی نے جہاد وروح جہاد لکھی تھی جو مقبول ہوئی۔مگر بعض علما اور نوجوانوں کو اس پر کچھ اشکالات ہوئے اور بعض لوگوں کو اعتراضات ہوئے،جن کے جواب میں مولانا نے جہاد اور آیات جہاد لکھی ہے اور اشکالات کا شافی جواب دیا ہے۔

یہاں ایک اصولی بات اور واضح رہنی چاہیے۔اور وہ یہ ہے کہ ایک تو ہے قرآن وسنت کا متن اور دوسرا ہے ان کا فہم۔ہمیں ان دونوں میں واضح طور پر فرق کرنا چاہیے اور محقق علما ہمیشہ ان میں واضح فرق رکھتے ہیں۔لیکن افسوس کہ اکثر اوقات ہم اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھ پاتے۔ظاہر بات ہے کہ متن ہمیشہ یکساں رہتا ہے،مگر ضروری نہیں کہ اس کے فہم میں بھی اسی طرح کی یکسانیت رہے اور نہ ہی یہ دین کا مطلوب ہے۔ اگر ایسا تسلیم کرلیا جائے جیسا کہ بہت سے روایت پرست سمجھتے ہیں تو اِس سے دین کی آفاقیت مجروح ہوتی ہے۔کسی عصر کا فہم دین دین کا ناگزیر حصہ نہیں ہوتا بلکہ دینی روایت کا حصہ ہوتا ہے اور جس سے علمی سفر کے

جاری رکھنے میں استفادہ کیا جاتا ہے۔فہم متن میں ہمیشہ ارتقا ہوتا رہتا ہے، تحقیق وتعبیر جدید کے ہمیشہ امکانات پائے جاتے ہیں۔ ہمارے روایتی حلقوں میں افسوس کہ نہ تو تحقیق وتفتیش کے اصول کو آزادانہ برتا جاتا ہے اور نہ فہم دین کی نئی جہات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔مثال کے طور پر جہاد کے بارے میں مسلمانوں میں بہت معروف ومشہور فہم یہ چلا آرہا ہے کہ نہ کفر کو برداشت کیا جائے گا اور نہ شوکت کفر کو اور ان دونوں کے خاتمہ کے لیے ہی جہاد کو مشروع کیا گیا ہے۔ جہاد کے بارے میں یہ روایتی تصور فہم متن میں قصور نظر کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے۔سبحانی صاحب نے اس کتاب میں متعلقہ آیات کریمہ کے مطالعہ اور احادیث کی تحقیق کے ذریعہ دلائل سے بتایا ہے کہ یہ کلیہ غلط ہے۔قرآن پاک سے فتنہ وفساد اور ظلم وزیادتی کے خاتمہ کے لیے جہاد کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ یہ جہاد سے متعلق آیات کی نئی تحقیق اور نیا فہم ہے جس پر علمی بحث وگفتگو کی مصنف نے اہل علم اور قارئین کو دعوت دی ہے۔

اس کتاب سے بعض غلط مفاہیم کی تصحیح بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر بعض روایات کے زیراثر مسلمانوں میں یہ تصور رائج ہے کہ دین میں اکراہ پایا جاتا ہے۔ جب کہ قرآن کریم اس کی صریح الفاظ میں تردید کرتا ہے اور لا اکراہ فی الدین کو اصل الاصول بتاتا ہے۔فقہا اور علما عموماً یہ توجیہ کرتے ہیں کہ کئی روایات ایسی ہیں جو اکراہ کو ثابت کرتی ہیں۔مثال کے طور پر یہ بات کہ سات سال کی عمر میں بچہ کو نماز کا حکم دیا جائے اور دس سال کی عمر میں اس کو نماز نہ پڑھنے پر مارا جائے۔اب مسلمان گھروں میں، مکاتب اور مدارس میں ہر جگہ اس اصول کو اپلائی کیا جاتا ہے۔اسی طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ مرتد کی سزا دین میں قتل ہے۔ تارک نماز کو بعض فقہا قتل کردینے کی سزا تجویز کرتے ہیں وغیرہ یہ سب باتیں دین میں اکراہ کو بتاتی ہیں۔ اور تو اور شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں یہی لکھا ہے کہ دین میں اکراہ پایا جاتا ہے۔اب ایک سوال تو یہ ہے کہ موجودہ ذہن کو کیا ہم ان دلیلوں سے مطمئن کرسکتے ہیں؟ اور اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ ان طریقوں سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ کیا مار پٹائی سے بچہ یا طالب علم نماز کا پابند اور شوقین بن جاتا ہے؟ اس کا جواب نا ہے اور یہ سراسر حکیمانہ قرآنی اور نبوی منہج کے خلاف ہے۔ ہمارے ذہن میں خود ہمیشہ یہ سوال رہا کہ کیا اس غیر حکیمانہ طریقہ کو دین کی طرف اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے؟ اس کا شافی جواب کہیں نہیں ملتا تھا۔مولانا سبحانی کی تحقیق یہ ہے کہ (۱) یہ سب روایات ضعیف اور کمزور سندوں سے وارد ہوئی ہیں، اس لیے ان کو لا اکراہ فی الدین کے قرآنی حکم پر حکم بنانا درست نہیں۔(۲) تربیتی نقطۂ نظر سے بھی یہ فہم درست نہیں کہ بچوں یا طلبہ کو نماز وغیرہ کے لیے مارا پیٹا جائے اس کا صحیح طریقہ ان کو محبت آمیز نصیحت، خیر خواہانہ کونسلنگ اور شفقت آمیز مشاورت وتربیت ہے۔جس کے اثرات مثبت اور دیرپا ہوتے ہیں۔

یہ ایک مثال ہے ورنہ اور بھی کتنے ہی غلط مفاہیم وتصورات لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں جن کا ناقدانہ جائزہ لینے اور تصحیح کی ضرورت ہے۔ ہمارے خیال میں فقہاء کرام کا اکراہ کو جو استدلال ہے اس کا تفصیل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کفر کی وجہ سے اہل کفر چونکہ خدا کے باغی ہو جاتے ہیں اس لیے ان کی جان و مال اور آبرو اصلاً معصوم نہیں رہتے۔ (اہل عہد اور اہل ذمہ کا استثنا ہے) اگر ان کو یہ چیزیں ملی ہوئی ہیں تو یہ اہل اسلام کے طفیل میں ان کو حاصل ہیں۔ چنانچہ فقہا عام طور پر اس کے قائل ہیں کہ اہل کفر و اہل اسلام میں تعلقات کی اصل نسبت محاربہ کی ہے صلح و آشتی کی نہیں۔ اسی وجہ سے شافعیہ یہ کہتے ہیں کہ مسلم امام (مسلم حکومت) کو زیادہ سے زیادہ دس سال اہل کفر سے صلح کی گنجائش ہے اس سے زیادہ کی نہیں اور ان کو وقفہ وقفہ سے کافر حکومت پر حملہ کرتے رہنا چاہیے۔ حنفیہ کی رائے دوسری ہے اور ان کے نزدیک صلح و جنگ اصلاً مسلم مملکت کے مصالح پر موقوف ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کلاسیکل فقہی موقف نظر ثانی کا محتاج ہے یا نہیں۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے اس موقف سے تھوڑا سا اختلاف کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ کفر مسئلہ نہیں ہے اور صرف کفر کی وجہ سے کوئی جنگ نہیں کی جائے گی، مگر شوکتِ کفر البتہ اسلام کے نزدیک قابل برداشت نہیں ہے۔ مکتب فراہی کے علما مثلاً جاوید احمد غامدی صاحب اس پر قانون اتمام حجت کا استدلال پیش کرتے ہیں۔ بہرحال سبحانی صاحب کا موقف اِن دونوں موقفوں سے مختلف ہے اور وہ صرف اہل کفر کے فتنہ وفساد کو جہاد کا سبب مانتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے قانون اتمام حجت کو بھی جہاد کا سبب نہیں مانا ہے۔ اِس موقف پر علما اور اہل نظر نقد و نظر کریں اور ایک علمی بحث و مباحثہ کا آغاز ہو، یہی ان تحریروں کا مقصد ہے۔

سیرت و تاریخ اسلام کا بھی قرآن کی روشنی میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ غزوہ احد کے بارے میں اس عام غلط فہمی کا پردہ بھی مصنف نے چاک کیا ہے کہ مسلمانوں کو اس غزوہ میں شکست ہوئی تھی۔ نبیؐ وقت کی موجودگی میں اور قرآن کے اس اصول کی روشنی میں کہ: **انا لننصر رسلنا والذین آمنوا فی الحیاة الدنیا ویوم یقوم الاشھاد** (المومن:۵۱) اس مشہور عام بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر خود اس غزوہ کی جو تفصیلات سیر و تاریخ کی کتابوں میں آئی ہیں ان کی کڑیاں جوڑنے سے ایک مختلف تصویر سامنے آتی ہے جو مشہور عام Narrative کے بالکل متضاد ہے لہٰذا اس پر از سرنو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں کتاب کا صفحہ ۱۸۲) سیرت سے متعلق بعض روایات و واقعات کے متعلق مشہور عام غلطیوں کو مصنف مدظلہ نے آیات قرآنیہ کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض جوشیلے علما اور جذباتی نوجوانوں کو جب جہاد و متعلقات جہاد کے متعلق حقائق کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ واویلا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ مغربی

سازش کا حصہ ہے اور جہاد کی منسوخی کی کوشش کی جارہی ہے ۔مصنف نے جذبۂ خیرخواہی کے ساتھ ان کی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے ۔(ص ۱۸۷)

خاکسار کا خیال ہے کہ جن لوگوں کو قرآن کی روشنی کفایت کرتی ہے ان کے لیے لا اکراہ فی الدین اور مرتد کی سزا وغیرہ کے معاملات میں مصنف کی تحقیق کافی ہوگی۔ ویسے حرف آخر علمی دنیا میں کچھ نہیں ہوتا۔ان مسائل پر بحث وگفتگو کی پوری گنجائش موجود ہے لیکن علمی استدلال کے ساتھ۔البتہ جو لوگ روایات کے اسیر اور تقلیدی ذہنیت کے حامل ہیں ان کے لیے کوئی بھی چیز کفایت نہیں کرتی۔اصلاح احوال کے لیے مولانا سبحانی نے علما واہل علم حضرات سے یوں اپیل کی ہے:''اب حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ علما کرام کو اپنی غلطیوں پر نظر ثانی کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ماضی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی کرنے اور لوگوں کو صحیح بات سمجھانے کی کوشش کریں۔کسی سے غلطیاں ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔البتہ غلطیوں پر اصرار کرنا نہایت خطرناک بات ہے''۔(ص ۲۳۶)

چوتھے باب میں مصنف نے جرح وتعدیل کے بعض اصولوں پر نظر ثانی پر زور دیا ہے۔ظاہر ہے کہ جرح وتعدیل کے اصول اجتہادی ہیں کوئی منصوص چیز نہیں اور جب منصوص نہیں تو ان میں نظر ثانی میں کیا مضائقہ ہوسکتا ہے۔کیوں کہ راویوں کی توثیق وتجریح میں مختلف اقوال ہیں۔ایک محدث ایک راوی کی تضعیف کرتا ہے جب کہ دوسرا اس کی تضعیف کررہا ہوتا ہے۔درایت کے کم استعمال کی وجہ سے کتنی ہی ایسی روایتیں ہیں جو تفسیر وحدیث، سیرت وتاریخ اور دوسرے دینی علوم میں داخل ہوگئی ہیں جو دین کو ذبح کرتی ہیں۔قرآن کی ثقاہت کو مجروح اور رسول اللہ ﷺ کی عصمت کو داغ دار کرتی ہیں۔مثال کے طور پر تدوین قرآن کی روایات، قراءات کے اختلافات وغیرہ۔کسی نے صحیح کہا ہے:

یہ امت روایات میں کھوگئی
حقیقت خرافات میں کھوگئی

حد تو یہ ہے کہ تلک الغرانیق العلا والی بے سر وپا روایت کتنی ہی تفسیروں میں بلا تضعیف کے نقل کر دی گئی ہے۔بہرحال یہ موضوع تو تفصیل کا متقاضی ہے اور اس پر یہاں گفتگو کرنے سے تحریر تبصرہ کی حد سے نکل جائے گی۔مختصر یہ کہ یہ کتاب فکر ونظر کے باب واکرتی اور اذہان وقلوب کو تفکر وتدبر پر ابھارتی ہے۔کتاب ہدایت پبلشرز نئی دہلی نے اچھے گٹ اپ کے ساتھ شائع کی ہے۔قریباً ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔قیمت ۲۲۰ بہت مناسب ہے اور کتاب بڑے آسان اور رواں اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ہر خاص وعام اس سے استفادہ کرسکتا ہے۔امید ہے کہ سبحانی صاحب کی جہاد پر ان پرمغز تحریروں سے ایک نئے ڈسکورس کا آغاز ہوگا۔

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی

جامعہ کا ششماہی امتحان منسوخ

جامعہ کے تعلیمی کلینڈر کے مطابق ماہ نومبر ۲۰۲۰ء میں ششماہی امتحان ہونا طے تھا لیکن کووڈ کی وجہ سے آن لائن تعلیم کا انتظام کرنا پڑا۔ اس صورتِ حال میں ششماہی امتحان کرانا کافی مشکل اور دقت طلب کام تھا۔ اس لیے اس سال ششماہی امتحان منسوخ کر دیا گیا ہے اور طلبہ وطالبات کو آگاہ کر دیا گیا کہ حالات جب ساز گار ہوں گے تو اس وقت ٹیسٹ لیا جائے گا۔

جامعہ میں آن لائن اور آف لائن تعلیم

ماہ اگست سے جامعہ میں آن لائن تعلیم کا آغاز ہو گیا تھا البتہ حالات میں بہتری اور حکومت کی اجازت سے اب جامعہ میں بھی آف لائن تعلیم کا بھی آغاز یکم نومبر ۲۰۲۰ء سے ہو گیا ہے۔ قرب وجوار کے طلبہ وطالبات آف لائن تعلیم اور دور دراز کے طلبہ آن لائن تعلیم سے مستفید ہو رہے ہیں۔ مقامی طلبہ وطالبات اپنے سر پرستوں کی تحریری اجازت سے ہی جامعہ میں کلاس کر رہے ہیں اور گائیڈ لائن کا پاس ولحاظ کر رہے ہیں۔

'تفہیم النحو' کا رسم اجرا

۲۶/نومبر ۲۰۲۰ء بروز پنجشنبہ ابواللیث ہال میں جامعہ کے قدیم استاد وسابق صدر مدرس جناب مولانا محمد عمران فلاحی کی کتاب 'تفہیم النحو' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ ناظم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی کی صدارت میں یہ تقریب منعقد ہوئی۔ قاری محمد زاہد قاسمی کی تلاوت قرآن سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ مولانا انیس احمد فلاحی مدنی (معاون مہتمم وصدر مدرس) نے افتتاحی گفتگو میں فرمایا کہ اسباق النحو علامہ حمید الدین فراہی کی ایک اہم کتاب ہے۔ مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح کے علاوہ دیگر مدارس کے فارغین کے لیے یہ کتاب سمجھنا مشکل ہوتا ہے اس لیے اس کتاب کی تسہیل کے لیے جامعہ کے سینئر استاد مولانا محمد عمران فلاحی نے 'تفہیم النحو' نام سے کتاب مرتب کی جس سے نحو کے اساتذہ وطلبہ کے لیے آسانی ہوگی۔ ناظم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی کے بدست تفہیم النحو کا اجرا عمل میں آیا۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر محی الدین غازی نے فرمایا کہ جب مدارس سے اس طرح کی کتاب شائع ہوتی ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدارس کے اساتذہ حرکت میں ہیں۔ مولانا محمد عمران فلاحی ہر مضمون کو درجے میں آسان کرکے پڑھاتے ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب میں بھی یہی کوشش کی ہوگی۔ اسباق النحو میں بہت اجمال ہے اس کے خدوخال کی وضاحت اس کتاب تفہیم النحو کے ذریعہ واضح ہوگی۔ مہتمم تعلیم وتربیت مولانا نعیم الدین اصلاحی نے کتاب کے خدوخال کو واضح کیا اور جامع انداز میں ناقدانہ تبصرہ کیا۔

مولانا محمد عمران فلاحی نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ جامعہ کے ذمہ داران کی طرف سے ایک عرصہ سے مطالبہ تھا کہ اسباق النحو کے اجمال کو واضح کیا جائے۔ تاکہ اساتذہ وطلبہ کے لیے آسانی ہو۔ چنانچہ لاک ڈاؤن میں وقت ملا تو میں نے یہ کتاب مرتب کی۔ تفہیم النحو اول اور دوم کے ساتھ ساتھ تفہیم الصرف اول اور دوم بھی شائع ہونے والی ہے۔ اور اس کتاب کے مقدمہ میں واضح کیا گیا ہے کہ نحو کے اساتذہ اس کو باریک بینی سے پڑھیں اور غلطیوں کی وضاحت کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کی جاسکے۔ اور اس کے ساتھ دوسرے مکتب فکر کے لوگ بھی اس کتاب سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں اس کا خیال بھی اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

ناظم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی نے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ ہم لوگوں پر جو ایک قرض تھا مولانا محمد عمران فلاحی صاحب نے اس قرض کو اتارا ہے۔ معاون مہتمم مولانا انیس احمد فلاحی مدنی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس نشست میں جامعہ کے تمام ہی شعبہ جات کے اساتذہ کرام شریک ہوئے۔

ڈاکٹر مسعود عالم فلاحی کی جامعہ آمد پر استقبالیہ تقریب

۳۰؍نومبر ۲۰۲۰ء بروز دوشنبہ ابواللیث ہال میں ایک استقبالیہ تقریب ڈاکٹر مسعود عالم فلاحی صاحب (قائم مقام وائس چانسلر خواجہ معین الدین چشتی یونی ورسٹی لکھنؤ) کی جامعہ آمد پر منعقد ہوئی۔ مصباح الباری فلاحی کی تلاوت قرآن سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے استقبالیہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ بہت ہی خوشی کا موقع ہے کہ جامعہ کے ایک ہونہار طالب علم اس وقت ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہم صمیم قلب سے ڈاکٹر مسعود عالم کا استقبال کرتے ہیں اور یہ ہمارے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر مسعود عالم فلاحی اپنی گفتگو میں فرمایا کہ جب مجھے وائس چانسلر کی ذمہ داری ملی تو میں کانپ گیا لیکن میں نے مادر علمی کو ہمیشہ اپنے آگے رکھا کیوں کہ مچھلی بغیر پانی کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح میں بھی مادر علمی کو ہمیشہ آگے رکھتا ہوں۔ مجھے جو ذمہ داری ملی ہے ان شاء اللہ ہمیشہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کروں گا۔ چاہے یہ ذمہ داری دو ہی دن کے لیے ہو لیکن ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔ یہی میں نے جامعہ سے سیکھا ہے۔ طلبہ کی مدد کرنا اور ان کی رہنمائی صحیح نہج پر کرنا میری اولین ترجیح ہے۔

مولانا محمد طاہر مدنی (ڈائرکٹر دعوت وارشاد) نے فرمایا کہ جب مجھے یہ خبر ملی کہ جامعہ کے ایک مایہ ناز طالب علم کو یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی ذمہ داری ملی ہے تو ہماری خوشی ومسرت کی انتہا نہ رہی۔ میرے علم کے مطابق یہ پہلا موقع ہے کہ ایک یونی ورسٹی کے سب سے اہم منصب کی ذمہ داری کسی فلاحی کو ملی ہے۔ آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آپ نے جامعہ سے عالمیت وفضیلت کے بعد بی اے علی گڑھ سے، جے این یو سے ایم اے اور دہلی یونی ورسٹی سے ایم فل پھر اس کے بعد پی ایچ ڈی کی۔ اس کے بعد پروفیسر اور اب وائس چانسلر ہیں۔ آپ نے کم عمری میں ترقی کے منازل طے کر لیے ہیں۔

ناظم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی نے اختتامی کلمات پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ مہمان خصوصی ہمارے بہت ہی عزیز رہے ہیں اور اس کا حق بھی آپ نے ادا کیا ہے۔ آپ شروع ہی سے لکھنے پڑھنے کے عادی رہے ہیں اور تحقیقی انداز میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جس کی وجہ سے ترقی کے اہم منصب پر فائز ہیں۔ مہمان خصوصی جامعہ کی ہر طرح کی مدد کر رہے ہیں۔ اور انھوں نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ جامعہ سے طلبہ آئیں اور ہم ان کی صحیح رہنمائی کریں گے۔

جامعہ میں شعبۂ حفظ کے لیے نصاب و نظام پر غور

۲۳ر نومبر ۲۰۲۰ء بروز دوشنبہ دفتر اہتمام میں ایک نشست شعبہ حفظ کے نئے نصاب اور نظام پر غور وخوض کرنے کے لیے منعقد ہوئی۔ اس نشست میں شعبۂ حفظ وتجوید کے تمام معلمین نے شرکت کی۔

اس نشست میں شعبۂ حفظ وتجوید کے نظام اور نصاب کو بہتر بنانے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز سامنے آئیں:

(۱) حفظ کے تمام طلبہ اقامتی ہوں، مقامی طلبہ کے لیے بھی دارالاقامہ کو لازمی قرار دیا جائے۔ (۲) فجر سے قبل ایک گھنٹہ اور فجر کے بعد ایک گھنٹہ اساتذہ کرام کی نگرانی میں طلبہ حفظ کریں۔ (۳) ۸تا۱۲ بجے درجات چلائے جائیں۔ ۱۲تا۳ بجے طعام، نماز اور قیلولہ کے لیے مختص ہو۔ (۴) تین بجے تا اذان عصر اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ اعادہ کریں۔ (۵) مغرب تا عشاء اساتذہ کرام کی نگرانی میں طلبہ حفظ کریں۔ (۶) شعبہ حفظ کا الگ سے کوئی نگراں نہ ہو۔ ہر استاد اپنے متعلق طلبہ کی نگرانی کا ذمہ دار ہوگا۔ (۷) مقامی طلبہ کو ہر ہفتہ گھر جانے کی اجازت نہ ہو اور تعطیل پر جانے والے طلبہ جمعہ کی شام مدرسہ حاضر ہو جائیں۔ اسی طرح حفظ کے اساتذہ کے لیے بھی مدرسہ میں قیام کو لازمی بنایا جائے۔ دو ہفتہ پر گھر جانے کی اجازت ہو۔ بیک وقت دو اساتذہ کو ہی ہفتہ میں چھٹی دی جائے اور ان کی تنخواہ بھی مناسب کر دی جائے۔

اخبارانجمن

ڈاکٹر انعام اللہ اعظمی فلاحی خدمت خلق کے ایوارڈ سے سرفراز

سعودی عرب کے ریاض شہر میں واقع کراؤن پلازہ ہوٹل میں ڈاکٹر انعام اللہ اعظمی فلاحی کو خدمت خلق کے لیے سفیر ہند ڈاکٹر اوصاف سعید کے ہاتھوں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بھارتی سفارت خانہ کی طرف سے لوگوں کی سماجی خدمات کے اعتراف میں اس تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ بالخصوص یہ ایوارڈ ان لوگوں کو پیش کیا گیا، جنہوں نے لاک ڈاؤن میں خدمت خلق کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر انعام اللہ نے لاک ڈاؤن میں کورونا مریضوں کو ہاسپٹل پہنچانے، طعام وقیام اور علاج ومعالجہ کے لیے مکمل تعاون پیش کیا، کورونا کی وجہ سے مرنے والے لوگوں کو سفارت خانہ کے تعاون سے کاغذی کارروائی مکمل کرا کے جلد تدفین کے انتظامات کرائے، انہیں خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر صاحب کو یہ ایوارڈ پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب جامعہ سے فارغ ہیں۔ پورانچل ایسوسی ایشن کے چیف کوآرڈینیٹر، علی گڑھ یونیورسٹی اولڈ بوائز ریاض کورکمیٹی کے رکن، جامعہ ملیہ اسلامیہ المنائی ایسوسی ایشن ریاض کے اہم رکن اور انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح ریاض یونٹ کے صدر ہیں۔ اس سے پہلے بھی ڈاکٹر صاحب کو مختلف خدمات کے اعتراف میں کئی ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے۔

جامعہ مالی بحران کا شکار

لاک ڈاؤن کی وجہ سے پوری دنیا متاثر ہوئی اور مدارس پر بھی اس کا اثر پڑا۔ چنانچہ اس سال جامعہ مالی بحران کا شکار ہو گیا ہے۔ ذمہ داران جامعہ نے جامعہ کے بہی خواہان، ہمدردوں اور فلاحی حضرات سے تعاون کی اپیل بھی کی ہے۔ اساتذہ کرام مسلسل وفد کی شکل میں سفر کر رہے ہیں۔ چنانچہ حافظ احسان الحق فلاحی، عبدالرحمٰن ندوی، قاری محمد شاکر قاسمی، قاری عبدالباری، قاری اقبال احمد اصلاحی، احسن جمال قاسمی، ماسٹر محمد خالد، اخلاق کریمی، محمد اقرار احمد اصلاحی، امیر فیصل فلاحی، قاری محمد زاہد قاسمی، حافظ محمد مصطفیٰ فلاحی، قاری

عبدالغفار قاسمی، اور مولانا معین الدین فلاحی صاحبان اب تک سفر کر چکے ہیں۔لیکن ابھی تک جامعہ اس مالی بحران پر قابو نہیں پا سکا ہے۔

وفیات

۲۳/اکتوبر۲۰۲۰ء بروز جمعہ جامعہ کے شعبہ اعلیٰ کے استاد ماسٹر ذاکر نعمانی کی والدی محترمہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔مرحومہ تین سال سے فالج کے مرض میں مبتلا تھیں اور اچانک اٹیک کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔مرحومہ اعلیٰ اخلاق و کردار کی صفات سے متصف تھیں۔صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔نہایت شریف النفس، شریعت کی پابند، خدمت خلق کے جذبے سے سرشار اور ہر ایک کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہنے والی خاتون تھیں۔

پس ماندگان میں آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔آمین۔

۱۹/ستمبر۲۰۲۰ء بروز شنبہ کو جامعہ کے استاد مولانا مبین اختر قاسمی کی نانی جان کا انتقال ہو گیا۔مرحومہ ایک ہفتہ سے کوما میں تھیں۔عمر تقریباً ۸۰ سال تھی۔مرحومہ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔

اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔آمین۔